احیائے اسلام

مولانا وحید الدین خاں

بسم الله الرحمن الرحيم

Ahya-e-Islam
By Maulana Wahiduddin Khan

ISBN 81-85063-31-1

First published 1982
Third reprint 1995

Al-Risala Books
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4697333
Fax : 91-11-4697333

Printed by Nice Printing Press, Delhi

احیائے اسلام

مولانا وحیدالدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

فہرست

دیباچہ

وسط افریقہ میں نیروبی کے پاس ایک پہاڑی مقام ہے جس کا نام کیگالی (Kigali) ہے۔ یہاں قدرتی مناظر کے خوبصورت ماحول میں ایک جدید اسلامی مرکز قائم کیا گیا ہے جس کا فرانسیسی نام (Le Centre Culturel Islamique) ہے۔ اس مرکز میں تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع دسمبر ۱۹۸۱ میں ہوا جس میں راقم الحروف کو دعوت دین اور احیاء اسلام کے موضوع پر لکچر دینے کے لئے بلایا گیا۔

اس موقع پر پیش کرنے کے لئے چند لکچر ترتیب دئے گئے تھے۔ تاہم بعض ناگزیر اسباب کی بناپر میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔ اب یہ مجموعہ زیر نظر کتاب کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ موجودہ کتاب ان لکچروں کا اردو ایڈیشن ہے۔ ان کا عربی ایڈیشن علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوگا۔

ان خطبات میں مختلف پہلوؤں سے جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ کہ اسلام کے احیاء کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ گہرا فکر اور دور رس منصوبہ بندی ہے۔ سطحی خوش فہمیوں اور وقتی کارروائیوں سے یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام (۲۱۶۰-۱۹۸۵ ق م) نے اپنی اولاد کو حجاز میں بسایا اور کعبہ کی تعمیر کرتے ہوئے یہ دعا کی کہ خدایا، تو ان کے اندر ایک پیغمبر بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ یقیناً تو عزیز و حکیم ہے (البقرہ ۱۲۹)

حضرت ابراہیم کی یہ دعا پوری طرح قبول ہوگئی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، نبی عربی کا ظہور اس دعا کے ڈھائی ہزار سال بعد چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کا یہ طریقہ نہیں کہ اچانک واقعات کو ظاہر کر دے۔ خدا اپنے فیصلہ کو حالات کے درمیان ظاہر کرتا ہے نہ کہ طلسمات کے درمیان۔ حضرت ابراہیم کی دعا کی قبولیت کے باوجود نبی عربی کا ظہور اس وقت ہوا جب کہ حالات اپنی فطری رفتار سے چل کر وہاں پہنچ چکے تھے جہاں پہنچنے کے بعد وہ وقت آگیا تھا کہ اب آخری رسول کو دنیا میں بھیج دیا جائے۔

اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ربانی حکمت درکار ہے۔ اس کے لئے اس یقین کی ضرورت ہے کہ مستقبل میں چھپی ہوئی فصل کی خاطر ہم اپنے دانہ کو زمین میں دفن کر سکیں۔ اس کے لئے اس صبر کی ضرورت ہے کہ چنار کے پودے کو درخت کی صورت میں دیکھنے کے لئے ہم سو سال کا انتظار کر سکیں۔ اس کے لئے وہ بلند نظری درکار ہے کہ پھول کی طرح ہم دوست دشمن سب کے لئے مہکیں اور

سورج کی طرح ہر پست و بلند کے لئے چمکیں۔ پیغمبر کی دعا جب حقائق کی پوری رعایت کرتے ہوئے اپنی تکمیل کو پہنچی تو ہماری کوئی جدوجہد حقائق کی رعایت کے بغیر کس طرح واقعہ کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔

کسی نظام زندگی کا غلبہ ہمیشہ نظامِ فکر میں غلبہ کے بعد ہوتا ہے۔ جمہوری نظام جدید دنیا میں اس وقت رائج ہوسکا جب کہ طویل نظریاتی جدوجہد کے بعد بادشاہی طرز فکر پر جمہوری طرز فکر کو عمومی غلبہ حاصل ہوگیا۔ اسی طرح اشتراکی نظام اس وقت قائم ہوا جبکہ اعلیٰ ترین دماغوں کی مسلسل کوشش نے اجتماعی ملکیت کے تصور کو انفرادی ملکیت کے تصور پر نظری فتح دے دی۔ اسلام کا احیار بھی آج کی دنیا میں اسی طرح ہوگا۔

قدیم زمانہ میں شرک کے نظام کو غلبہ حاصل تھا۔ رسول اور آپ کے اصحاب نے بے پناہ دعوتی کوشش سے موحدانہ طرز فکر کو مشرکانہ طرز فکر پر غالب کیا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ توحید کی بنیاد پر زندگی کا عملی نظام بنایا جاسکے۔ دور اول میں جو انقلاب آیا تھا اس کے اثرات تقریبًا ایک ہزار سال تک جاری رہے۔ اس کے بعد حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اب موجودہ زمانہ میں یہ تبدیلی اس انتہا کو پہنچی ہے کہ قدیم شرک کی جگہ جدید ہیومنزم نے لے لی ہے۔ آج کی دنیا میں ہر طرف انسان پرستی کا غلبہ ہے۔ جو معاملہ پہلے توحید بمقابلہ شرک تھا، وہ اب خدا پرستی بمقابلہ انسان پرستی ہوگیا ہے۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے پہلے ہمیں فکری انقلاب لانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ کوئی حقیقی عملی انقلاب وجود میں آسکے۔

جس طرح قدیم زمانہ میں ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں خدا نے شرک کے مقابلہ میں توحید کو غالب کرنے کے حالات فراہم کئے تھے، اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں توحید کے مقابلہ میں انسان پرستی کو زیر کرنے کے لئے بھی بہترین موافق حالات جمع کر دئے گئے ہیں۔ تاہم ان کو استعمال کرنے کے لئے صبر اور ہوش مندی کی ضرورت ہے۔ ہمارے اسلاف نے پچھلے مواقع کو صبر اور ہوش مندی کے ساتھ استعمال کرکے دور اول میں توحید کو غالب کیا تھا۔ اسی طرح اب دور ثانی میں بھی جدید پیدا شدہ مواقع کو صبر اور ہوش مندی کے ساتھ استعمال کرکے ہی اسلام کو دوبارہ غالب اور سربلند کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام نہ طلسماتی خوش فہمیوں سے ہوگا اور نہ پرجوش ہنگامہ آرائیوں سے۔ اسلام کے غلبۂ اول کی تاریخ اس کے غلبۂ ثانی کے طریقہ کو بتانے کے لئے بالکل کافی ہے۔

وحیدالدین

۸ رمئی ۱۹۸۲

معرفت کی دو سطحیں

زمین و آسمان کا نظام انتہائی حیرت انگیز نظام ہے۔ سائنس داں اس پر غور کرتا ہے۔ مگر سائنسداں کائنات کے مطالعہ سے کیا پاتا ہے۔ سائنس داں کے لئے کائنات بس حسابات اور اعداد و شمار کی ایک چیز ہوتی ہے ـــــــ زمین کا قطر ۲۵ ہزار میل ہے۔ سورج زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے، وغیرہ۔ سائنس داں کو کائنات کے مطالعہ سے بس اس قسم کی کچھ شماریاتی تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔

مگر اسی کائنات کو جب ایک مومن دیکھتا ہے تو وہ اس کے لئے حقیقت اعلیٰ سے ملاقات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں، وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تونے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب، تونے جسے آگ میں ڈالا اس کو تونے بڑی رسوائی میں ڈال دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکارتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب، پس تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب، تونے جو وعدے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے ـــــــ (آل عمران رکوع آخر)

سائنس داں نے بھی کائنات کو دیکھا اور مومن نے بھی اسی کائنات کو دیکھا۔ مگر سائنس داں کائنات کو سائنسی نظر سے دیکھتا ہے اور مومن کائنات کو ایمانی نظر سے۔ نظر کا یہ فرق دونوں کے مشاہدہ کے حاصل میں غیر معمولی فرق پیدا کر دیتا ہے۔ سائنسی نظر سے کائنات کو دیکھنے والے کو صرف شماریات کی قسم کی کچھ ظاہری چیزیں ملی تھیں۔ مگر جس نے کائنات کو ایمانی نظر سے دیکھا اس کے لئے کائنات خدائی جلووں کا معنوی خزانہ بن گئی۔ اس کو یہاں ایک خدائی اسکیم نظر آئی۔ اس نے کائنات کے پردے میں جنت اور جہنم کو دیکھ لیا۔ اس میں اس کو اعتراف حق کی غذائیں ملنے لگیں۔ اس میں اس نے کائنات کے بامقصد ہونے کا راز دریافت کر لیا۔ وہ اس کے ذریعہ سے خالق کے عین قریب پہنچ گیا۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ معرفت کی دو سطحیں ہیں۔ ایک ظاہری سطح اور دوسری باطنی اور گہری سطح۔ یہی بات ہر چیز کے بارے میں ہے اور یہی بات قرآن کے بارے میں بھی ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سات حرفوں پر اترا ہے۔ اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ اور ہر حد کے لئے ایک مطلع ہے (عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما اُنزِلَ القرآنُ علیٰ سبعۃِ احرفٍ لکلِّ آیۃٍ منہا ظھرٌ وبطنٌ ولکلّ حدٍّ مُطَّلَعٌ، شرح السنۃ)

مُطَّلَع عربی زبان میں جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اگر آپ عام جگہ پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کو صرف قریب کی چیزیں دکھائی دیں گی۔ اور اگر آپ زیادہ بلندی پر کھڑے ہوں تو بہت دور تک کی چیزیں آپ کو نظر آنے لگیں گی۔ اسی طرح قرآن سے استفادہ کے بھی دو مطلع (مقام مشاہدہ) ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کو سمجھنے کی دو سطحیں بن جاتی ہیں۔ قرآن کا ایک ظاہری مفہوم ہے جو سادہ طور پر اس کو پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن کا ایک گہرا مفہوم ہے جو غور و فکر کے ذریعہ واضح ہوتا ہے۔ ظاہری مطلع سے قرآن کو سمجھنا یہ ہے کہ آپ اس کے ظاہری الفاظ پر ٹھہر جائیں۔ الفاظ قرآن سے بظاہر جو مفہوم نکل رہا ہے اس سے آگے جانے کی کوشش نہ کریں۔ باطنی مطلع سے قرآن کو سمجھنا یہ ہے کہ آپ الفاظ کے گہرے معانی تک پہنچنے کی کوشش کریں، سطروں کے ساتھ بین السطور میں چھپے ہوئے معانی پر بھی غور کریں۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہاں ہم دو مثالیں نقل کریں گے۔

۱۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو۔ اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ اس میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں۔ پھر وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں۔ اس وقت باغ پر تیز گرم بگولا آئے اور باغ جھلس جائے۔ اللہ اس طرح اپنی نشانیاں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو (بقرہ ۲۶۶)

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک روز اپنی مجلس میں یہ آیت پڑھی اور کہا کہ اس آیت نے آج کی رات مجھے سونے نہیں دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تمھارا کیا خیال ہے کس کے بارہ میں یہ آیت اتری ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ کی مثال دی گئی ہے اور یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ چیزیں خدا کی نعمتیں ہیں۔ خدا جب چاہے ان کو دے اور جب چاہے گرم ہوائیں بھیج کر انھیں جلا دے۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک اس آیت کا مطلب بس وہی تھا جو بظاہر اس کے الفاظ سے نکل رہا تھا۔

آخر میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بولے جو اس وقت نوجوان تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں انسانی عمل کی تمثیل ہے۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ کون سا عمل۔ انھوں نے کہا: یہ ایسے آدمی کی مثال ہے جو مالدار ہے۔ وہ اللہ کی

اطاعت کر رہا ہے۔ پھر اللہ نے اس کی آزمائش کے لئے اس کے پاس شیطان کو بھیجا۔ اس سے متاثر ہو کر وہ آدمی گناہ کا کام کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے اعمال ختم ہو گئے۔ حضرت عمر نے فرمایا: میرے بھتیجے تو نے سچ کہا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے ان الفاظ میں آیت کی تشریح کی:

عُنی بها العمل - ابن آدم افقر ما یکون الی جنته اذا کبر سنه وکثرت عیاله وابن آدم افقر ما یکون الی عمله یوم القیامة (تفسیر ابن کثیر)

اس مثال سے عمل مراد لیا گیا ہے۔ انسان اپنے باغ کا اس وقت زیادہ محتاج ہوتا ہے جب کہ اس کی عمر بڑھے اور اولاد زیادہ ہو جائے۔ اور انسان اپنے عمل کا سب سے زیادہ محتاج قیامت کے دن ہوگا

جو لوگ قرآن کی مذکورہ آیت کو ظاہری مطلع سے دیکھ رہے تھے، انھوں نے باغ کو لفظی طور پر بس باغ کے معنی میں لے لیا۔ مگر جو لوگ آیت کو باطنی مطلع سے دیکھ رہے تھے انھوں نے اس کو تمثیل کے معنی میں لیا۔ پہلے مفہوم میں آیت صرف دنیا کے پھل کے ملنے اور پھر چھن جانے کے معنی میں تھی۔ مگر دوسرے مفہوم میں وہ آخرت کی عظیم حقیقت کو واضح کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو خلافت کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کوئی کہتا خلیفہ کا انتخاب مہاجرین میں سے ہونا چاہئے، کوئی کہتا کہ انصار میں سے۔ کوئی اس منصب کے لئے ایک شخصیت کا نام لیتا اور کوئی دوسری شخصیت کا۔ اس سلسلے میں ابن ابی شیبہ نے ابن سیرین سے جو روایت نقل کی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

واتی الناس عند بیعة ابی بکر ابا عبیدة بن الجراح فقال: تاتونی وفیکم ثانی اثنین (کنز العمال، جلد ۳ صفحہ ۱۴۰)

ابوبکر رض سے بیعت کے وقت کچھ لوگ ابو عبیدہ بن جراح رض کے پاس آئے۔ انھوں نے جواب دیا: تم لوگ خلافت کے لئے میرے پاس آئے ہو جب کہ تمھارے درمیان ثانی اثنین (ابوبکر) ہیں۔

ہجرت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کیا تو آپ کا قافلہ صرف دو آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ایک آپ اور دوسرے حضرت ابوبکر۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: جب کافروں نے اس کو نکالا، جب وہ دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے (اذ اخرجه الذین کفروا ثانی اثنین اذ هما فی الغار، توبہ ۴۰)

جو لوگ لفظی سطح پر قرآن کو دیکھ رہے تھے، ان کے لئے یہ مسئلہ ابھی غیر طے شدہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مگر جو لوگ قرآن کو معنوی سطح سے دیکھ رہے تھے، ان کے لئے قرآن کی یہ

آیت خلافت کی ترتیب کے سوال کو پہلے ہی طے کر چکی تھی ۔ قرآن میں ثانی اثنین (دو میں کا دوسرا) کے لفظ میں انھوں نے خدا کی اس منشا کو پالیا کہ اس کے نزدیک ابوبکر دو میں کے دوسرے ہیں، وہ رسول خدا کے بعد نمبر دو پر ہیں ۔ قرآن کے الفاظ میں یہ معنوی اشارہ پانے کے بعد ان کے لئے اس معاملہ میں اختلاف وانتشار کا کوئی سوال نہ تھا ——— جن لوگوں نے آیت کو ظاہری مطلع سے دیکھا ان کو یہ آیت صرف غار ثور کے ایک تاریخی واقعہ سے متعلق نظر آئی ۔ مگر جن لوگوں نے قرآن کی آیت کو باطنی مطلع سے دیکھا ان کے لئے وہ ترتیب خلافت کے نازک سوال کا جواب بن گئی ۔

یہی معاملہ پورے دین اور پورے قرآن کا ہے ۔ ایک دین داری اور قرآن فہمی وہ ہے جو ظاہری سطح پر ہوتی ہے ۔ آدمی بس ظاہری چیزوں کو جانتا ہے اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے ۔ دوسری دینداری اور قرآن فہمی وہ ہے جو گہرائیوں میں اتری ہوئی ہو ۔ آدمی الفاظ یا ظواہر سے گزر کر اندر چھپے ہوئے حقائق تک پہنچ جائے ۔ وہ خدا کو اس کے غیبی روپ میں دیکھ لے ۔ یہ دوسرا آدمی بھی بظاہر دیکھنے میں پہلے آدمی کی طرح ہوتا ہے مگر نفسیات کے اعتبار سے وہ بالکل دوسرا انسان ہوتا ہے ۔ اس کی منصوبہ بندی اور پہلے شخص کی منصوبہ بندی میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا خدائی منصوبہ بندی اور انسانی منصوبہ بندی میں ۔

معرفت کی اس دہری سطح کا تعلق شخصی دینداری سے بھی ہے اور اجتماعی دینداری سے بھی ۔ ایک شخص جس کی رسائی "سطور" تک ہو وہ قرآن کی آیتوں سے صرف ایک ایسا دین لے سکے گا جو اس کے ظاہری جسم کو چھوئے مگر اس کے اندرون تک نہ اترے ۔ اس کے برعکس جس کی رسائی "بین السطور" تک ہوگی وہ قرآن کی اسی آیت میں ایسے معانی پائے گا جو اس کی روح کے لئے ربانی غذا بن جائیں ۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تقویٰ کا لباس زیادہ بہتر ہے (الاعراف ۲۶) یہاں عام آدمی نے لباس سے جسمانی کپڑا مراد لے لیا اور لباس تقویٰ کا مطلب یہ سمجھا کہ وہ لباس جس کی وضع قطع شرعی حدود کے مطابق ہو ۔ مگر اسی آیت کو عروہ بن الزبیر نے پڑھا تو انھوں نے پایا کہ یہاں لباس کا لفظ تمثیلی مفہوم میں ہے ۔ انھوں نے لباس التقویٰ کی تشریح خشیۃ اللہ سے کی ۔ یعنی جس طرح جسم انسانی کی زینت یہ ہے کہ وہ ملبوس ہو اسی طرح روح انسانی کی زینت یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والی ہو (تفسیر ابن کثیر)

یہی معاملہ دین کے اجتماعی پہلو کا ہے ۔ اجتماعیات میں دین کو قائم کرنا ایک ظاہری سطح کے اعتبار سے ہوتا ہے اور ایک باطنی سطح کے اعتبار سے ۔ غزوۂ حدیبیہ (۶ھ) کے موقع پر عام مسلمان اس انداز میں سوچتے تھے کہ جہاد یہ ہے کہ کافروں سے لڑ جائیں ۔ کیونکہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے ۔ مگر پیغمبر خدا اور ابوبکر صدیق کو نظر آیا کہ اسلام کی فتح اس میں ہے کہ کافروں کی تمام شرطیں مان کر ان سے ناجنگ معاہدہ کر لیا

جائے تاکہ حالات معتدل ہوں اور اسلام کے لئے دعوتی عمل کی راہ کھل جائے۔ ظاہر بیں لوگ معاملہ کو تلوار کی سطح پر حل کرنا چاہتے تھے۔ مگر حکمت وبصیرت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو نظر آیا کہ معاملہ کو دعوت کے میدان تک لے جائیں۔ کیونکہ دعوت کا میدان وہ میدان ہے جہاں اسلام کو ابدی فوقیت حاصل ہے۔

یہی مثال ایک اور پہلو سے حضرت حسن اور حضرت حسین کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ دونوں کو بالکل یکساں قسم کی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ حضرت حسن کے سامنے معاویہ بن ابی سفیان کا مسئلہ تھا اور حضرت حسین کے سامنے یزید بن معاویہ کا۔ حضرت حسین نے معاملہ کو اس کی نظری صورت میں بس حق اور ناحق کے اعتبار سے دیکھا۔ وہ حق کے علم بردار بن کر ناحق سے لڑ گئے۔ اس کے برعکس حضرت حسن نے معاملہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ ان کو مفید بات یہ نظر آئی کہ وہ ٹکراؤ کو ختم کر کے خانہ نشیں ہو جائیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت حسین کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ وہ ناحق کو بدستور زندہ چھوڑ کر کربلا کے میدان میں شہید ہو جائیں۔ اور حضرت حسن کے طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کو سیاسی استحکام مل گیا اور باہمی لڑائی ختم ہو کر اسلام کی توسیع کا کام از سر نو پوری قوت کے ساتھ شروع ہو گیا۔

اجتماعی معاملات میں گہری سیاست کو پانے کا راز صبر ہے۔ اس کے برعکس سطحی سیاست کا سبب بے صبری۔ مسلمان اس زمین پر اکیلے نہیں ہیں بلکہ دوسرے گروہوں کے ساتھ ہیں۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے اور یہاں ہر ایک کو عمل کا موقع ہے، خواہ وہ عادل ہو یا ظالم۔ اب اگر ایسا ہو کہ مسلمانوں کو جب بھی کسی شخص یا گروہ کی طرف سے کوئی گزند پہنچے تو وہ فوراً مشتعل ہو جائیں اور وقتی جذبات کے تحت اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو وہ ہمیشہ سطحی کارروائیاں کریں گے اور اس کے نتیجہ میں ہمیشہ ناکام رہیں گے۔

لیکن اگر مسلمان ایسا کریں کہ گزند کے ابتدائی جھٹکے کو سہہ لیں، وہ مشتعل نہ ہو کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کریں۔ وہ اپنی کمزوریوں اور فریق ثانی کی قوتوں کا جائزہ لیں اور خالص حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے یہ رائے قائم کریں کہ واقعہ کا اصل سبب کیا ہے اور اس کو کوئی مزید خرابی لائے بغیر کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ اگر مسلمان اس "صابرانہ" طریقہ کو اختیار کریں تو یقینی طور پر وہ گہری سیاست کو پالیں گے اور گہری سیاست اختیار کرنے والے کے لئے کبھی ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

بے صبری آدمی کو جذباتی عمل یا سطحی کارروائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور صبر آدمی کو منصوبہ بند عمل کا راستہ دکھاتا ہے اور امتحان کی اس دنیا میں سطحی عمل کے مقابلہ میں منصوبہ بند عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔

طریق مطالعہ

حضرت آدم علیہ السلام کی امت دجلہ و فرات کے درمیانی علاقہ میں بسی ہوئی تھی جس کو تاریخ میں میسوپوٹامیا کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس وقت کے مسلمان تھے۔ جب ان میں بگاڑ آیا تو ان کی اصلاح کے لئے خدا کے پیغمبر حضرت نوح بھیجے گئے۔ مگر قوم اپنی غفلت اور سرکشی کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی۔ بالآخر ان پر عظیم سیلاب کی صورت میں خدا کا عذاب آیا۔ حضرت نوح اپنے تھوڑے سے پیروؤں کے ساتھ ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ صرف یہی کشتی اور اس کے سوار سیلاب کی زد سے بچے، باقی تمام لوگ غرق کر دئے گئے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح کا ایک لڑکا آنجناب کا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہوا تھا، وہ بھی عمومی سیلاب کی زد میں آگیا۔ حضرت نوح نے اس کو پکارا کہ ہماری کشتی میں آجاؤ۔ لڑکے نے جواب دیا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاتا ہوں، وہ مجھ کو اس طوفان سے بچالے گا۔ پیغمبر نے کہا کہ آج کوئی چیز کسی کو امر اللہ سے بچانے والی نہیں (ہود ۴۳) حضرت نوح سیلاب کو ایک خدائی معاملہ سمجھتے تھے اس لئے وہ اس کو دیکھ کر خدا کی کشتی میں داخل ہو گئے۔ مگر ان کے لڑکے نے اس کو صرف ایک موسمی معاملہ سمجھا اس لئے وہ پہاڑ کی طرف بھاگا۔ یہ فرق اتنا بنیادی تھا کہ ایک نے نجات پائی اور دوسرے کو سیلاب کی موجوں نے نگل لیا ——— کسی طوفان کو اگر آپ خدائی معاملہ سمجھیں تو آپ خدا کی طرف دوڑیں گے، آپ کے اندر تضرع کی کیفیت ابھرے گی (انعام ۴۲) اس کے برعکس اگر آپ اس کو عام اسباب کے تحت واقع ہونے والا معاملہ قرار دیں تو آپ کے اندر صرف غفلت اور سرکشی پیدا ہوگی، جیسا کہ حضرت نوح کے لڑکے میں پیدا ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں بھی مسلمان ایک بہت بڑے طوفان سے دوچار ہیں۔ وہ یہ کہ مسلمان ساری دنیا میں کافر قوموں اور بے دین طاقتوں کی زد میں آگئے ہیں۔ خواہ مسلم اکثریت کے علاقے ہوں یا مسلم اقلیت کے، غیر مسلم قومیں ہر جگہ مسلم قوموں کو اپنے نشانہ پر لئے ہوئے ہیں۔ یہ قومیں کہیں براہ راست طور پر مسلمانوں کو مغلوب کئے ہوئے ہیں اور کہیں خود مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو ان کے دوسرے گروہ کے خلاف استعمال کر کے بالواسطہ طور پر اپنے ظالمانہ ارادے پورے کر رہی ہیں۔

اہل ایمان کے بارے میں خدا نے بار بار وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے (الانفال ۱۹) وہ اہل ایمان کی طرف سے دفاع کرتا ہے (الحج ۳۸) وہ ہرگز کافروں کو ان پر غالب آنے کا موقع نہیں دے گا (النساء ۱۴۱) اس لئے لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ مسلمانوں کے حق میں خدائی تنبیہ ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک خدائی معاملہ ہے نہ کہ محض ایک انسانی معاملہ۔ مگر مسلمانوں کے سوچنے کا انداز اس سلسلے

میں کیا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان آج مختلف الفاظ میں ایک ہی بات کو دہرار ہے ہیں : یہ مسلمانوں کے خلاف اسلام دشمن طاقتوں کی سازش ہے۔ ہمارے تمام لکھنے والے قلم اور تمام بولنے والی زبانیں اسی ایک بات کو ثابت کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ کسی کو بھی ان واقعات میں خدا کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ البتہ کسی نے اس میں "وھائٹ ہاؤس" کا ہاتھ دریافت کر رکھا ہے اور کسی نے "ریڈ ہاؤس" کا۔ کوئی کسی مشرک قوم کو الزام دے رہا ہے اور کوئی کسی کافر قوم کو۔

یہ واحد سب سے بڑی گمراہی ہے جس میں موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین مبتلا ہیں۔ انھوں نے ایک کھلے ہوئے خدائی واقعہ کو انسانی واقعہ کے خانہ میں ڈال دیا ہے۔ حضرت نوح کے لڑکے نے اپنے زمانہ کے طوفان کے بارے میں جو غلطی کی تھی ٹھیک وہی غلطی مسلمان موجودہ زمانہ کے طوفان کے بارے میں کر رہے ہیں۔ وہ ایک خدائی معاملہ کو انسانی معاملہ سمجھ رہے ہیں۔ اگر وہ اس کو خدائی معاملہ سمجھتے تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ ان کے اندر اپنی اصلاح کا جذبہ ابھرتا۔ ان کی ساری سوچ خدارخی سوچ بن جاتی۔ مگر جب اس کو انھوں نے انسانی سازش قرار دیا تو اس کے بعد یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے اندر دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ ابھرے۔ خدا کو آدمی قادر مطلق جانتا ہے۔ اس لئے جب کسی سختی کو خدا کی طرف سے سمجھا جائے تو اس کے جواب میں اس کے اندر عجز کی نفسیات ابھرتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کو وہ اپنے جیسا سمجھتا ہے اس لئے جب کسی سختی کو انسان کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کے جواب میں نفرت اور انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر یہی دوسرا واقعہ پیش آیا ہے۔

کتاب آسمانی کی حامل قوموں کے لئے خدا کا یہ خاص قانون ہے کہ ان کے اندر جب بگاڑ آتا ہے تو ان پر خدا کی طرف سے تنبیہی سزائیں آتی ہیں تاکہ وہ جاگیں اور اپنی اصلاح کریں۔ یہود جو پچھلے دور کے حامل دین تھے، ان پر ان کے بگاڑ کے نتیجہ میں بار بار اس قسم کی تنبیہی سزائیں آتی رہیں۔ بائبل میں تفصیل سے ان تنبیہات کا ذکر ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش سے پہلے کی سزاؤں کا ذکر زبور، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل میں موجود ہے اور حضرت مسیح کے بعد کی سزا کا ذکر متی اور لوقا کی انجیلوں میں ملتا ہے۔ مثلاً ایک کتاب میں یہود کے بگاڑ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے : اس لئے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث (اسرائیل) سے نفرت ہو گئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضہ میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمراں بن گئے (زبور باب ۱۰۶)

یہود کے ساتھ خدا نے جو معاملہ کیا اس کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے : اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ پس جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو ہم نے تمھارے اوپر ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے۔

وہ تمھارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جو پورا ہو کر رہا۔ پھر ہم نے تمھاری باری ان پر لوٹائی اور مال و اولاد سے تمھاری مدد کی اور تمھاری تعداد بڑھا دی۔ اگر تم اچھے کام کرو گے تو اپنے لئے کرو گے۔ اور اگر تم برے کام کرو گے تو اپنے لئے کرو گے۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تمھارے اوپر مسلط کیا تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں گھس پڑیں جس طرح پہلی بار گھس پڑے تھے اور تاکہ جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اس کو تہس نہس کر ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمائے اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے (بنی اسرائیل ۸-۴)

جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے، یہود پر خدا کی یہ سزائیں انسانی ہاتھوں سے جاری کی گئیں۔ مثلاً ۷۲۱ ق م میں سامریہ کو مغلوب کر کے حکومت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ہزاروں یہودی مار ڈالے گئے۔ فلسطین کے بڑے حصہ سے یہودیوں کو نکال کر وہاں غیر قوم کے لوگوں کو بسا دیا گیا۔ یہ کام خدا کے فرشتوں نے آکر انجام نہیں دیا بلکہ یہ اشوری فرماں روا سارگون (Sargon II) تھا جس نے اس خدائی سزا کو یہود کے اوپر نافذ کیا — ۵۸۶ ق م میں جب یروشلم کے یہودی قتل کئے گئے اور غلام بنائے گئے اور بیت المقدس کو جلا دیا گیا تو یہ کام بھی آسمانی طاقتوں کے ذریعہ نہیں ہوا بلکہ بابل کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے یہ سارے کام انجام دئے۔ ۱۶۸ ق م میں بیت المقدس پر حملہ ہوا۔ یہودیوں کو غلام بنا کر ان کے مقدس صحیفوں کو جلا دیا گیا۔ اس بار بھی یہ کام مافوق ذرائع سے نہیں ہوا بلکہ شام کا بادشاہ انطیوخوس چہارم (Antiochus IV) تھا جس نے یہود کے خلاف یہ تمام سفاکیاں کیں۔ ۶۳ ق م میں ایک اجنبی قوم فلسطین میں داخل ہوئی۔ اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ یہ واقعہ جس کے ذریعہ سے ہوا وہ دوبارہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھی بلکہ یہ رومی فاتح پومپی (Pompey) تھا جس نے اس عمل کو انجام دیا۔ اسی طرح ۷۰ء میں بیت المقدس پر حملہ ہوا اور ہیکل سلیمانی کو ڈھا دیا گیا۔ یہود کے مقدس شہر کو ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ یہودی قتل ہوئے اور بقیہ غلام بنا لئے گئے۔ اس بار بھی یہ کام خود خدا نے ظاہر ہو کر نہیں کیا بلکہ یہ رومی بادشاہ ٹیٹس (Titus) تھا جس نے اس تخریبی منصوبہ کو مکمل کیا۔

اس طرح کے تمام واقعات کے بارے میں یہود یہی کہتے ہیں کہ وہ اسرائیل دشمن طاقتوں کی سازش تھی، ان کا خدائی سزا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان واقعات کی انسانی نوعیت انھیں یہ کہنے کا پورا موقع دے رہی ہے۔ مگر قرآن اور بائبل دونوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب یہود کے حق میں خدا کی تنبیہی سزائیں تھیں جو انسانوں کے ہاتھوں ان کے اوپر جاری کی گئیں۔ یہود اگر ان واقعات کو خدا کی طرف سے سمجھتے تو ان کے اندر توبہ اور انابت

کا جذبہ ابھرتا ، وہ تقویٰ اور اطاعت کی زندگی اختیار کرتے ۔ مگر جب انھوں نے ان واقعات کو اسرائیل دشمن طاقتوں کا ظلم قرار دیا تو اس نے صرف ان کی غفلت اور سرکشی میں اضافہ کیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اپنی سزا کو کھلے فرشتوں کے ذریعہ نہیں بھیجتا ، بلکہ عام انسانی واقعات کے درمیان ان کا نفاذ کرتا ہے ۔ تاکہ امتحان کا پردہ باقی رہے ۔ جن کے اندر کچھ صلاحیت موجود ہے وہ اس کو خدائی معاملہ سمجھ کر چوکنے ہوں اور اپنی اصلاح کریں ۔ اور جو لوگ بے حسی اور غفلت میں ڈوب چکے ہیں وہ اس کو انسان کا ظلم اور سازش قرار دے کر اپنی سرکشی میں اضافہ کرتے رہیں ۔

مسلمان آج جن ناموافق حالات میں اپنے کو گھرا ہوا پاتے ہیں ان کو دشمنوں کی کارروائی قرار دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کا پورا طرز فکر منفی اور غیر حقیقت پسندانہ ہو کر رہ گیا ہے ، ان کے اندر وہ مثبت ذہن نہیں ابھرا جو کسی صالح اور نتیجہ خیز جدوجہد کی لازمی بنیاد ہے ۔

حالات کو ظلم اور سازش کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بنا پر انھیں کسی معاملہ میں اپنی غلطی نظر نہیں آتی ، وہ بس دوسروں کو یک طرفہ الزام دیتے رہتے ہیں ۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کا دینی طرز فکر بالکل سیاست رخی ہو گیا ہے جب کہ صحیح مسلم فکر وہ ہے جو آخرت رخی ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک بے کردار قوم بن کر رہ گئے ہیں ، کیونکہ کردار اپنے آپ پر ذمہ داری لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ حقوق طلبی کے سوا اپنی کوئی ذمہ داری جانتے ہی نہیں ۔ اسی سبب سے ایسا ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا طرز عمل اصولی کے بجائے قومی ہو گیا ہے ، کیونکہ جو لوگ دوسروں کو اپنا قومی حریف سمجھیں ان کی روش قدرتی طور پر قومی ہو جائے گی ۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپس کی لڑائی آج مسلمانوں میں تمام قوموں سے زیادہ پائی جاتی ہے ، کیونکہ غیروں کو جب وہ اپنی جھنجلاہٹ کا شکار نہیں بنا پاتے تو اپنوں ہی کے اوپر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں ۔

پھر اسی غلط فکری کا یہ عظیم نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ان کے اندر دعوتی ذہن نہیں ابھرا جو کہ امت مسلمہ کا اصل مقصد وجود ہے ۔ دوسری قوموں کو خدا کے دین رحمت کا مدعو بنانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ داعی کے دل میں ان کے لئے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ پایا جاتا ہو ۔ مگر ظلم اور سازش کی اصطلاحوں میں سوچنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے بارے میں مسلمانوں کے اندر مخالفانہ نفسیات پیدا ہو گئی ۔ مسلمانوں کے دل میں ان مدعو اقوام کے لئے نفرت اور بیزاری کے سوا کسی اور جذبہ کی گنجائش ہی نہ تھی ، پھر وہ ان کو دین رحمت کا مخاطب بناتے تو کیوں کر بناتے ۔

ذہنی بیداری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بستیوں کے لوگ اگر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔ مگر انھوں نے جھٹلایا (الاعراف ۹۶) یہی بات یہود کے بارے میں کہی گئی ہے کہ انھوں نے نبی آخرالزماں کو جھٹلادیا، اگر وہ ان پر ایمان لاتے تو وہ اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی اپنا رزق حاصل کرتے (المائدہ ۶۶)

ایک رسول کا اقرار کرنے پر اتنی زیادہ برکتوں کی خوش خبری کیوں دی گئی — بہت سے لوگ اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ کلمۂ ایمان میں طلسماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں اور زبان سے اس کا تلفظ کرتے ہی اسی طرح تمام خزانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں جس طرح قدیم افسانوی کہانی میں "سم سم" کہنے سے ایک شخص کے لئے خزانوں کا محل کھل گیا تھا۔ مگر اس قسم کا خیال سراسر بے بنیاد ہے۔ اگر ان برکتوں کا تعلق کلمۂ ایمان کی لفظی ادائگی سے ہوتا تو آج مسلمانوں کی زندگیوں میں ہر زمانہ سے زیادہ اس کا ظہور ہورہا ہوتا۔ کیونکہ کلمۂ ایمان کا تلفظ کرنے والے آج ہر زمانہ سے زیادہ عظیم مسلم امت (ایک ارب) کی صورت میں زمین کے اوپر موجود ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ایمان کے مدعیوں کی بے پناہ کثرت کے باوجود آج ان کے لئے نہ آسمانی برکتوں کے دروازے کھل رہے ہیں اور نہ زمینی برکتوں کے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں ایمان کا لفظ فکری انقلاب کے ہم معنی ہے۔ اس وقت جو لوگ آپ پر ایمان لائے ان کے لئے ایمان کا مطلب واضح طور پر، ایک ذہنی فیصلہ تھا۔ اس حقیقت کو بآسانی اس وقت سمجھا جاسکتا ہے اگر یہ دیکھا جائے کہ جب یہ آیتیں اتریں اس وقت یہود کے لئے یا عرب کے لوگوں کے لئے ایمان لانے کا مطلب عملاً کیا تھا۔

آج جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے ہیں تو یہ لفظ بولتے ہی ہمارے ذہن میں وہ مسلّمہ شخصیت آجاتی ہے جس کے ساتھ ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخی عظمتیں وابستہ ہوچکی ہیں۔ مگر بعثت کے وقت لوگوں کی نظر میں آپ صرف "محمد بن عبداللہ" تھے۔ اس وقت یہ ساری تاریخ ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ لوگوں کو آپ عام انسانوں کی طرح بس ایک معمولی انسان نظر آتے تھے۔ مگر یہود کا اور مشرکین عرب کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہود کو ایک ایسے دین کا حامل ہونے کا فخر حاصل تھا جس کی حیثیت معروف مسلّم تھی۔ ان کے دین کے ساتھ موسیٰ اور داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے کتنے سابق پیغمبروں کے نام شامل تھے جو لمبی تاریخ کے نتیجہ میں لوگوں کے ذہنوں پر اپنی عظمت قائم کرچکے تھے۔ یہی حال عرب کے مشرکین کا تھا۔

وہ اپنے سلسلہ کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ جیسے قدیم پیغمبروں سے جوڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کو کعبہ کا وارث اور ملت ابراہیمی کا حامل سمجھتے تھے، اور یہ وہ چیزیں تھیں جن کی تاریخی اہمیت سیکڑوں برس کی روایات کے نتیجہ میں تسلیم شدہ بن چکی تھی۔ بالفاظ دیگر، پیغمبر اسلام اپنی تاریخ کے آغاز پر تھے اور یہود اور قبائل عرب اپنی تاریخ کے اختتام پر۔

ایسی حالت میں چودہ سو سال پہلے والے پیغمبر اسلام کو ماننا اور آپ کا ساتھ دینا ان لوگوں کے لئے کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ قائم شدہ دین سے نکل کر ایک ایسے دین کو اختیار کرنا تھا جو ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ مفادات سے وابستہ سچائی کو چھوڑ کر مجرد سچائی کو اختیار کرنا تھا۔ یہ مادی عظمتوں سے اوپر اٹھ کر غیر مادی عظمتوں کا ادراک کرنا تھا۔ یہ حال کے پردہ میں مستقبل کا مشاہدہ کرنا تھا۔ یہ محسوس خداؤں سے گزر کر چھپے ہوئے خدا کو پالینا تھا۔

اس قسم کا واقعہ کسی انسان کی زندگی میں اس طرح پیش نہیں آتا جیسے وہ ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں چلا گیا ہو۔ اس قسم کا واقعہ آدمی کی زندگی میں ہمیشہ بھونچال بن کر داخل ہوتا ہے۔ یہ ایک شعوری انقلاب ہوتا ہے جب کہ آدمی سوچے سمجھے ارادہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑتا ہے اور سوچے سمجھے ارادہ کے تحت دوسری چیز کو لے لیتا ہے۔ اس میں آدمی کی قوت فیصلہ متحرک ہوتی ہے۔ اس کے جذبات میں عظیم ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ اس کو قربانیوں کے پل کو پار کر کے ایک طرف سے دوسری طرف جانا پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی پوری زندگی اس طرح ہل جاتی ہے جیسے کوئی طوفان کسی درخت کو ہلا دے۔ جب کچھ لوگ اس طرح انقلابی انداز میں ایک نظریہ کو اختیار کریں تو اس کے بعد عین قانون قدرت کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ زمین پر بالکل نئے قسم کے انسان وجود میں آتے ہیں۔ اور ان کے ملنے سے وہ سماج بنتا ہے جس سے ایسے حیرت ناک نتائج برآمد ہوں جو اس سے پہلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ جب عرب میں اسلام کی آواز بلند کی تو اس وقت دوسرے ادیان کا حال یہ تھا کہ وہ پہلے سے چلے آرہے تھے اور اس بنا پر وہ جمے ہوئے مفادات کی بنیاد پر قائم ہو چکے تھے۔ اسلام ابھی ایک مجرد نظریہ تھا، جب کہ دوسرے ادیان نے منظم ادارہ (Institution) کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کو اپنا دین بنانا ماحول کے اندر بے قیمت ہو جانے کے ہم معنی تھا۔ دوسرے ادیان سے وابستہ ہو کر آدمی کے تمام مفادات محفوظ رہتے تھے۔ وہ سماج کا معزز رکن شمار ہوتا تھا۔ مگر اسلام کو اختیار کرتے ہی وہ ایک ایسے دین کا فرد بن جاتا تھا جس نے سماج کے اندر اپنی حیثیت مسلّم نہیں کی تھی۔ جس کے ساتھ ابھی تک مفادات وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ پُر فخر روایات والے

گروہ سے چھوٹ کر ایک ایسے گروہ کا جزء بن جاتا تھا جس کے ساتھ ابھی پُر فخر روایات وابستہ نہ ہوئی ہوں۔ ایسی حالت میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کے لئے اسلام محض ایک کلمہ کا تلفظ نہ تھا بلکہ ایک انقلابی فیصلہ کے ہم معنی تھا۔ اسلام کی آواز نے ان کے خیالات کی دنیا میں ایک زبردست ہلچل پیدا کی۔ ان کی تمام فکری قوتیں جاگ اٹھیں۔ ان کے اندر شدت سے یہ ذہن ابھرا کہ اپنے آپ پر نظر ثانی کریں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ انھوں نے بے پناہ ارادہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑا اور بے پناہ ارادہ کے تحت دوسری چیز کو اختیار کر لیا۔

ایسا کرتے ہوئے انھوں نے تعصبات کے پردہ کو چاک کیا۔ مفادات اور مصلحتوں کو نظر انداز کیا۔ یہ خطرہ مول لیا کہ اپنے خاندان، اپنے قبیلہ اور اپنے سماج سے کٹ کر وہ دنیا میں اکیلے رہ جائیں۔ انھوں نے ایک شعوری فیصلہ کے تحت اپنے آپ کو تقلیدی زمین سے کھینچ کر ہٹایا اور شعوری فیصلہ کے تحت ایک زندہ عقیدہ کی زمین پر اپنے کو کھڑا کیا ——— دور اول کے مسلمانوں کے لئے ایمان ایک فکری انقلاب کے ہم معنی تھا اس لئے اس ایمان سے جو لوگ پیدا ہوئے وہ بھی انقلابی انسان تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ایمان ایک بے روح عقیدہ ہے اس لئے اس ایمان سے جو افراد تیار ہوتے ہیں وہ بھی بے روح انسان ہیں، ان میں نہ فکر کے اعتبار سے کوئی جان ہوتی ہے اور نہ کردار کے اعتبار سے۔

کتاب روپی دین اور سماج روپی دین

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا اور پھر وہ پہلے کی طرح اجنبی ہو جائے گا۔ پس مبارکی ہے اجنبیوں کے لئے (بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں جس طرح اجنبی بننے کی قیمت پر لوگوں کو اسلام ملا تھا اسی طرح بعد کے دور میں بھی جس کو اسلام ملے گا اجنبی بننے کی قیمت پر ملے گا۔

غور سے دیکھئے تو آج تاریخ دوبارہ وہیں لوٹ آئی ہے جہاں سے وہ شروع ہوئی تھی۔ آج ایک دین وہ ہے جو قرآن میں محفوظ ہے، دوسرا دین وہ ہے جو مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ پہلے دین کو کتاب روپی دین کہہ سکتے ہیں اور دوسرے دین کو سماج روپی دین۔ کتاب روپی دین وہ ہے جو قرآن و سنت میں محفوظ ہے۔ یہ دین گویا آج پیغمبر کا نمائندہ ہے۔ مگر یہ دین آج ماحول کے اندر اسی طرح اجنبی بن گیا ہے جس طرح وہ چودہ سو سال پہلے اجنبی تھا۔ دوسری طرف سماج روپی دین اسی طرح مکمل طور پر ایک منظم ادارہ بنا ہوا ہے جس طرح قدیم زمانہ میں یہودیت تھی۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی تحریکیں اسی دوسرے اسلام کی زمین پر چل رہی ہیں۔ بظاہر کوئی کُلّی اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے اور کوئی جزئی اسلام کا۔ مگر یہ تمام تحریکیں حقیقۃً سماج روپی دین کی سطح پر ابھری ہیں نہ کہ کتاب روپی دین کی سطح پر۔

صورت حال یہ ہے کہ آج اسلام میں اسی طرح گدیاں بن چکی ہیں جس طرح وہ پہلے یہودیت میں پائی جاتی تھیں۔ اسلام اب ایک ایسا نام بن گیا ہے جس کے اوپر چندے اور عہدے ملیں۔ جس کے نعرے پر عوام کی بھیڑ جمع کی جاسکے۔ جس کی بنیاد پر شخصیتیں بنیں اور قیادتیں ابھریں۔ اسلام آج ایک ایسا عنوان ہے جس کے سہارے ادارے قائم ہوں اور خطابات حاصل ہوں۔ اسلام آج ہر اعتبار سے ایک عظیم ترین مارکٹ ہے جس سے وہ تمام مادی فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں جو دنیا کے عام بازاروں سے کسی کو حاصل ہوتے ہیں۔

دوسری طرف کتاب ربی دین عملاً بے جگہ ہو چکا ہے۔ وہ محض ایک ذہنی تخیل کے طور پر فضا میں باقی ہے۔ کوئی شخص اگر اس کتاب والے دین کو اپنائے تو فوراً وہ محسوس کرے گا کہ وہ اپنے ماحول کے درمیان اجنبی ہو گیا ہے۔ ایسے آدمی کو اپنے اسلام کی یہ قیمت دینی پڑے گی کہ وہ لوگوں کو نئے دین کا حامل معلوم ہو۔ وہ بڑی بڑی دینی مجالس میں شرکت کے لئے نااہل قرار پائے۔ اونچی گدیوں میں سے کوئی گدی اس کو نہ ملے۔ قرآن سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود اس کو قرآنی جشن کی صدارت کے لئے نہیں بلایا جائے گا۔ حدیث کا عالم ہونے کے باوجود وہ کسی دینی مدرسہ کا شیخ الحدیث نہ بن سکے گا۔ مخلص اور متقی ہونے کے باوجود اس کا شمار بزرگوں میں نہیں ہوگا۔ دین کا گہرا فہم رکھنے کے باوجود دینی مسائل میں اس سے رجوع نہیں کیا جائے گا۔ خدا اور رسول کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دینے کے باوجود اس کو کسی دینی خطاب کا اہل نہیں سمجھا جائے گا۔ اور ان سب کی وجہ یہ ہوگی کہ ایسا آدمی جس دین پر قائم ہے وہ کتاب و سنت والا دین ہے اور منظم مذہب (Institutionalized Religion) کو ماننے والوں کے درمیان خالص کتاب و سنت والا دین اجنبی بن چکا ہے۔ لوگ دین کے نام سے جس چیز سے واقف ہیں وہ کچھ خارجی نقشے ہیں نہ کہ گہری ربانی حقیقتیں۔ وہ واقعات انسانی سے اپنا دین لے رہے ہیں نہ کہ واقعات خداوندی سے۔

شاہ ضرب

کیرم ایک گھریلو کھیل ہے۔ یہ کھیل ایک تختہ (بورڈ) پر کھیلا جاتا ہے۔ ایک بڑے چوکور تختہ کے بیچ میں روپیہ جیسی ۱۹ گوٹیں مرتب مجموعہ کی صورت میں سمیٹ دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد کھیل کا آغاز کرنے والا ایک خاص گوٹ (اسٹرائکر) لے کر تختہ کے ایک کونہ سے گوٹوں کے درمیانی مجموعہ پر نشانہ لگا کر پوری قوت سے مارتا ہے۔ اس کی مار اگرچہ مجموعہ کے صرف ایک نقطہ پر پڑتی ہے۔ لیکن مار اگر کامیاب ہے تو وہ گوٹوں کے پورے مجموعہ کو متاثر کر دیتی ہے۔ اب ایک ایک گوٹ اپنی جگہ سے ہٹ کر کھلاڑی کی زد میں آجاتی ہے۔ ایسی کامیاب مار کو کیرم بورڈ کی اصطلاح میں شاہ ضرب (Master Stroke) کہتے ہیں۔

خدا کے دین کو ازسرنو زندہ کرنے کے لئے بھی اسی قسم کے ایک شاہ ضرب کی ضرورت ہے۔ یہ شاہ

ضرب وہ ہے جو تنظیمی مذہب یا سماج روپی دین پر جے ہوئے لوگوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے اور ان کو ذہنی اعتبار سے اس مقام پر لائے جہاں وہ کتاب وسنت والے دین کے مخاطب بن سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہی واقعہ پیش آیا تھا۔ اب اسی واقعہ کو دوبارہ ظہور میں لانے کی کوشش کا نام تجدید دین ہے۔ آج تجدید دین کا مطلب اسی کارنبوت کو دہرانا ہے۔ نبی نے اپنے زمانہ میں سابقہ ادیان کی بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچہ کے مقابلہ میں خدا کے دین کو زندہ کیا تھا۔ آج خود اسلام کی بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچہ کے مقابلہ میں خدا کے خالص دین کو از سر نو زندہ کرنا ہے۔

اس عمل کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ لوگوں کا دینی جمود ٹوٹے۔ شخصیتوں اور اداروں میں اٹکے ہوئے لوگ براہ راست خدا کو اپنا مرکز توجہ بنائیں۔ جزئی مسائل کو دین سمجھنے والے اساسی امور کو دین سمجھیں اور طلسماتی فضائل پر بھروسہ کرنے والے لوگ حقائق کی بنیاد پر اپنے دین کی تعمیر کریں۔ جن لوگوں نے بے روح عملیات کو دین کے ہم معنی سمجھ لیا ہے وہ زندہ دین کی لذتوں سے آشنا ہوں۔ جن کے یہاں دین ابھی تک چھنگلیا کی مانند ایک ضمیمہ بنا ہوا ہے وہ ان کی زندگیوں میں اس طرح داخل ہو کہ وہ ان کے کردار کے لئے قوت محرکہ بن جائے۔ جو لوگ کچھ مصنوعی اعمال کو دین داری سمجھے ہوئے ہیں وہ حقیقی دین داری کی فضا میں داخل ہوں۔

پھر اسی میں دور جدید کی اس سب سے بڑی خرابی کا حل بھی ہے جس نے اسلام کو تمام دنیا میں مسلمانوں کی قومی تحریکوں کا ضمیمہ بنا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ وہ ساری دنیا میں غیر مسلم اقوام کی زد میں آگئے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر یہ ہوا کہ مسلمانوں کو دوسری قومیں ظالموں اور غاصبوں کے روپ میں دکھائی دینے لگیں۔ ان کے اندر ہر جگہ مقابلہ آرائی کا ذہن ابھر آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اب وہی باتیں اپیل کرتی ہیں جن میں ان کی دفاعی نفسیات کو تسکین ملتی ہو۔ مثلاً اسلام کی عسکری تعبیر، انبیاء کے مشن کو حکومت و سیاست کی اصطلاحوں میں بیان کرنا، دوسری قوموں کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف ہنگامہ آرائی، مصالحت (Adjustment) کے بجائے ٹکراؤ اور لڑائی کی باتیں، وغیرہ۔ یہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب اگر خاموش تعمیر اور دعوت آخرت کی بات کی جائے تو اس کو لوگ اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے یہ کوئی سازش ہے جو ان کو اپنے دشمنوں کے محاذ سے ہٹا کر غیر متعلق چیزوں میں مصروف کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ دین کو اگر قومی نقشوں میں بننے والے ڈھانچہ سے الگ کر کے ابدی حقیقتوں کی بنیاد پر کھڑا کر دیا جائے تو اس قسم کے تمام خیالات اپنے آپ بے زمین ہو جائیں گے۔ اسلام کی قومی تشریحات کسی آدمی کو اسی وقت تک اپیل کرتی ہیں جب کہ اس کا فکر قومی حالات کے نقشہ میں اٹکا ہوا ہو۔ اگر وہ قومی حالات سے اوپر اٹھ کر خدا کی ابدی کائنات میں جینے لگے تو اس قسم کی تشریحات و تعبیرات خود بخود اس کے لئے

بے کشش ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ذہنی بیداری یا فکری انقلاب ہی آج ملت اسلامی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کسی حقیقی کام کا واحد آغاز یہ ہے کہ ملت کے افراد جو سماج رخی اسلام کی زمین پر ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کو اس سے ہٹا کر دوبارہ کتاب رخی اسلام کی زمین پر کھڑا کیا جائے۔ اس کام کے قابل لحاظ حد تک انجام پانے کے بعد ہی ان کے اندر ربانی شعور اور الٰہی کردار پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ابتدائی مقصود جب تک حاصل نہ ہو، کوئی بڑا اقدام کرنا یا تو غیر سنجیدہ انسان کا کام ہو سکتا ہے یا اس شخص کا جس کی عقل جاتی رہی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری وہ تمام چیزیں جن کو ہم چاہتے ہیں وہ سب اسی فکری انقلاب کا ضمنی حاصل (By-product) ہیں۔ وہ سارے اہم ترین نتائج جن کے ہم منتظر ہیں وہ اسی ذہنی انقلاب کے بطن سے ظہور میں آتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب توہمات کی زنجیروں کو توڑتا ہے جس سے علمی ترقیاں وجود میں آتی ہیں۔ یہ فکری انقلاب افراد کے اندر حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے جس کے بعد وہ مختلف میدانوں میں بڑے بڑے کارنامے انجام دینے لگتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب لوگوں کے اندر آفاقیت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ غیر مفتوح کردار کے مالک بن جاتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب اپنے متاثر افراد کے اندر ربانی شعور ابھارتا ہے جس کے بعد وہ ایسی بے پناہ منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس کا توڑ کسی کے لئے ممکن نہ ہو۔ ذہنی انقلاب قوموں اور آبادیوں کو مسخر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ماننے والوں کا دبدبہ زمین پر قائم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ ذہنی انقلاب جہاں برپا ہوتا ہے وہاں بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے قدموں کے نیچے سے بھی رزق ابلتا ہے اور ان کے سروں کے اوپر بھی رزق برستا ہے۔ خدا اپنی دنیا بھی ان کے لئے لکھ دیتا ہے اور اپنی آخرت بھی۔

شریعتوں میں فرق کی حکمت

مذہبی جمود کو توڑنا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ مطلوب ہے کہ اس کے لئے اس نے ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کی شریعت میں فرق رکھا۔ مختلف پیغمبروں کا دین اگرچہ ایک تھا مگر ان کی شریعتوں میں باہم فرق رکھا گیا۔ اس فرق کی خاص حکمت یہی تھی۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک طریق عمل مقرر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔ مگر اس نے ایسا اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو (المائدہ ۴۸) ہر امت کے لئے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کے وہ پیرو ہیں۔ پس وہ اس امر میں تم سے جھگڑا نہ کریں اور تم اپنے رب کی طرف

دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو (الحج ۶۸) یہی بات تحویل قبلہ کے ذیل میں اس طرح فرمائی گئی ہے:
اور ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو (البقرہ ۱۴۸)
اس سلسلہ میں مزید ارشاد ہوا ہے کہ جس قبلہ پر تم اب تک تھے اس کو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے (البقرہ ۱۴۳)

شریعتوں میں فرق کی توجیہہ عام طور پر ارتقار کی اصطلاحوں میں کی جاتی ہے۔ یعنی خدا کی شریعت سادہ اور غیر کامل صورت سے ترقی کر کے کامل صورت تک پہنچی ہے اور شریعتوں کا باہمی فرق اسی سبب سے ہے۔ مگر یہ توجیہہ سراسر بے بنیاد ہے۔ قرآن میں واضح طور پر تبدیلیٔ شریعت کا سبب ابتلار بتایا گیا ہے نہ کہ ارتقار۔

شریعت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے دینی عقائد کا زندہ اظہار ہے۔ مگر ایک طریقہ پر نسل در نسل عمل کرتے کرتے ایسا ہوتا ہے کہ شریعت سے اس کی روح نکل جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا خشک ڈھانچہ بن جاتی ہے جس سے آدمی کا نفسیاتی رشتہ ٹوٹ چکا ہو۔ اس وقت خدا شریعت کے قدیم ڈھانچہ کو بدل دیتا ہے تاکہ تقلیدی عمل کا خاتمہ ہو اور لوگ زندہ احساس اور تازہ فیصلہ کے تحت نئی شریعت کو اپنی زندگیوں میں اختیار کریں۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ کون شعور کے تحت خدا کی عبادت کر رہا تھا اور کون جمود اور تقلید کے تحت۔ بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ قرار دینا تبدیلیٔ شریعت کی ایک مثال ہے۔ اور اس کی وجہ قرآن میں یہ بتائی گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کا متبع ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ یعنی اس بات کا امتحان کہ کون حقیقت کا پیرو ہے اور کون تقلیدی روایات کا۔ تقلیدی روایات کا پیرو اپنی مانوس عصبیتوں سے چمٹا رہے گا اور جو حقیقت کا پیرو ہے وہ تقلیدی عمل کو چھوڑ دے گا اور فوراً اصلی حکم پر قائم ہو جائے گا۔

اسلامی دعوت

جب بارش کا موسم آتا ہے اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ کالے بادل فضا میں منڈلانا شروع کرتے ہیں تو خدا کا فرشتہ خاموش زبان میں یہ اعلان کرتا ہے کہ کون ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا سارے کائناتی نظام کو اس کی موافقت میں جمع کردے اور اس کے بعد اس کے بیج کو سات سو گنا زیادہ فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج دین کا بھی ہے۔ خدا نے آج سارے اسباب دین کی موافقت پر جمع کردئے ہیں۔ سیکڑوں برس کی گردش کے بعد زمانہ نے فیصلہ کی جو بنیاد فراہم کی ہے وہ عین ہمارے حق میں ہے۔ اب ان امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ خدا کے بندے اٹھیں جو صرف خدا کے لئے اپنے آپ کو اس مشن میں دے دیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس مشن کے حوالے کریں گے ان کے لئے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کے عمل کا سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ انعام آخرت میں لوٹائے گا اور اسی کے ساتھ اگر اس نے چاہا تو موجودہ دنیا میں بھی۔

اسلامی تاریخ دو بڑے مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب اس کے تیسرے مرحلہ کا آغاز ہونا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو اس تیسرے مرحلہ کو شروع کرنے کی سعادت حاصل ہوگی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آج اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔ آج اس سے بڑا کوئی میدان عمل نہیں جس میں قوت والے اپنی قوت لگائیں اور اس سے بڑی کوئی مد نہیں جس میں پیسہ والے اپنا پیسہ خرچ کریں۔

اسلام کیا ہے

اسلام ایک لفظ میں توحید کا نام ہے۔ جس طرح درخت اصلاً ایک بیج کا نام ہوتا ہے اسی طرح اسلام کی اصل حقیقت توحید ہے اور بقیہ تمام چیزیں اسی توحید کے مظاہر اور تقاضے۔ توحید بظاہر یہ ہے کہ خدا کئی نہیں ہیں بلکہ خدا ایک ہے۔ مگر یہ توحید کوئی خشک گنتی کا عقیدہ نہیں ہے جو کچھ مقرر الفاظ دہرا کر آدمی کو حاصل ہو جائے۔ یہ اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر خدا کا اثبات ہے، یہ خدا کے مقابلہ میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہے۔ خدا قادر مطلق ہے اور بندہ عاجز مطلق۔ کوئی بندہ جب خدا کے ساتھ اپنی اس نسبت کو پالیتا ہے تو اسی کا نام توحید ہے۔ توحید یا ایک اللہ پر ایمان ایک شعوری فیصلہ ہے۔ یہ حق کا انکار کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے حق کو مان لینا ہے۔ اس اعتبار سے ایمان حقیقت واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اور حقیقت واقعہ کا شعوری اعتراف بلاشبہ اس دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔

یہی توحید دنیا کی تمام چیزوں کا دین ہے۔ زمین اور سورج انتہائی کامل صورت میں خدا کی تابعداری

کر رہے ہیں۔ شہد کی مکھی کمال درجہ پابندی کے ساتھ خدا کی مقرر کی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔ مگر ان میں سے کسی کی محکومی شعوری محکومی نہیں۔ وہ خود اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ ساری کائنات میں یہ صرف انسان ہے جو ارادہ اور شعور کے ساتھ اپنے کو محکوم بناتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کامل طور پر خدا کی فرماں برداری کر رہی ہے۔ مگر انسان کی فرماں برداری اختیاری ہے اور دوسری چیزوں کی فرمانبرداری بے اختیاری۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کو سجدہ کر رہی ہیں۔ مگر ایک انسان جب سجدہ کرتے ہوئے زمین پر اپنا سر رکھتا ہے تو یہ تمام عالم کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری چیزیں مجبورانہ سجدہ کر رہی ہیں مگر انسان شعور اور ارادہ کے تحت اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیتا ہے۔

انسان کے ذریعہ اس کائنات میں شعوری اور اختیاری محکومی کا واقعہ وجود میں آتا ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے جو اس کائنات میں شعور قدرت کے مقابلہ میں شعور عجز کی دوسری انتہا بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحہ پر "عدد" کے مقابلہ میں "صفر" کا ہندسہ تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلہ میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک شخص کا موحد بننا اس آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے جس کا انعام کوئی سب سے بڑی چیز ہی ہوسکتی ہے۔ اسی سب سے بڑی چیز کا نام جنت ہے۔ جنت کسی کے عمل کی قیمت نہیں۔ جنت کسی بندے کے لئے خدا کی یہ بخشش ہے کہ اس کے بندے نے اپنے رب کو وہ چیز پیش کر دی جو کائنات میں کسی نے پیش نہ کی تھی۔ اس لئے خدا نے بھی اس کو وہ چیز دے دی جو اس نے کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا تھا۔

جنت کیا ہے

جنت ایک انتہائی حیرت انگیز دنیا ہے جو خدا نے اپنے خاص بندوں کے لئے بنائی ہے۔ وہاں خدا کی صفاتِ کمال اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جنت کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہاں نہ حزن ہوگا اور نہ خوف۔ یہ ناقابلِ قیاس حد تک انوکھی صفت ہے۔ کیوں کہ دنیا میں ہم جانتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا دولت مند یا حکمراں اس پر قادر نہیں کہ وہ غموں اور اندیشوں سے خالی زندگی اپنے لئے حاصل کرے۔ جنت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہاں ہر طرف "سلام سلام" کا چرچا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسے بلند انسانوں کی آبادی ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہوں گے۔ ان کے دلوں میں دوسروں کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ جنت کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہاں آدمی جو غذا کھائے گا اور جو مشروبات پئے گا وہ بول و براز کی شکل میں نہیں خارج ہوگا بلکہ ایک خوشبودار ہوا نکلے گی اور اس کے ذریعہ تمام کثافت خارج ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسا لطیف مقام ہے جہاں غلاظت بھی بشکل خوشبو خارج

ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی جب کہ وہاں آدمی کی ہر خواہش پوری کی جائے گی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اتنی لذیذ جگہ ہے کہ آدمی ایک رات کی نیند کے بقدر بھی اس سے جدا ہونا پسند نہ کرے گا حالاں کہ وہ اس کے اندر کھرب ہا کھرب سال سے بھی زیادہ مدت تک رہے گا۔ کیسا عجیب ہوگا جنت کا پڑوس اور کیسی عجیب ہوگی جنت کی زندگی ۔ پھر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جنت وہ مقام ہے جہاں آدمی اپنے خدا کو دیکھ سکے گا۔ وہ خدا جو ہر قسم کی ناقابل قیاس خوبیوں کا مالک ہے۔ وہ خدا جس نے عدم سے وجود کو پیدا کیا ۔ وہ خدا جو آسمان کی عظمتوں کا خالق ہے۔ وہ خدا جس نے سورج کو چمکایا۔ وہ خدا جو درختوں کی سرسبزی اور پھولوں کی مہک میں ظاہر ہوا۔ ایسا خدا کیسا عظیم اور کیسا حسین ہوگا اس کا تصوراتی قیاس بھی کسی کے لئے ممکن نہیں۔ جس جنت میں ایسا نفیس ماحول ہو، جہاں کائنات کے رب کا دیدار حاصل ہوتا ہو اس کی لذتوں اور راحتوں کو کون بیان کرسکتا ہے

مومنانہ زندگی

ایسی قیمتی جنت کسی کو سستے داموں نہیں مل سکتی ۔ یہ تو اسی خوش نصیب روح کا حصہ ہے جو حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بندہ ہونے کا ثبوت دے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی عام دنیادارانہ زندگی کے ساتھ کچھ اسلامی عملیات کا جوڑ لگالے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی آدمی کی پوری زندگی بن جائے۔ اسلام ہاتھ کی چھنگلیا نہیں بلکہ وہ آدمی کا پورا ہاتھ ہے۔ جو شخص اسلام کو اپنی زندگی میں غیر موثر ضمیمہ بنا کر رکھے اس نے اسلام کی توہین کی۔ اسی طرح مومن ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آدمی "خدائی فوجدار" بن کر کھڑا ہوجائے اور حکمرانوں کے خلاف اپوزیشن کا پارٹ ادا کرنے کو اسلام کا کمال سمجھنے لگے ۔ اس قسم کی چیزیں اسلام نہیں، وہ خود ساختہ سیاست کو اسلام کا نام دینا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ اگر دین کی کم قدری کے مجرم ہیں تو دوسری قسم کے لوگ دین کی تحریف کے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں آدمی کو خدا کی ناراضگی کا مستحق بناتی ہیں نہ کہ خدا کے انعام کا۔

مومن وہ ہے جس کے سینہ میں اسلام ایک نفسیاتی طوفان بن کر داخل ہوا ہو۔ جو خدا کو اتنا قریب پائے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہوجائیں۔ جس کی تنہائیاں خدا کے فرشتوں سے آباد رہتی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کی زبان میں خدا کی لگام دے رکھی ہو۔ اور جس کے ہاتھوں اور پیروں میں خدا کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کو حشر کی آمد سے پہلے حشر کے میدان میں کھڑا کردیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر مرنے کے بعد گزرنے والا ہے وہ مومن پر جیتے جی اسی دنیا میں گزر جاتا ہے ۔ دوسرے لوگ جن باتوں کو اس وقت پائیں گے جب کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا، مومن ان باتوں کو اس وقت پالیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ

ہیں چھپا ہوا ہے۔ مومن پر قیامت سے پہلے قیامت گزر جاتی ہے جب کہ دوسروں پر قیامت اس وقت گزرے گی جب کہ وہ عملاً آچکی ہوگی۔

اسلامی دعوت

آگ کا انگارہ جب خارج کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے تو اسی کو ہم آنچ کہتے ہیں۔ برف کا تودہ جب اپنے ماحول کو اپنی حقیقت سے متعارف کرتا ہے تو اسی کو ٹھنڈک کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ مومن کا بھی ہے۔ زمین پر کسی مومن کا وجود میں آنا خود ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اسلامی دعوت ضرور وجود میں آئے گی۔ کسی نفس انسانی میں جب وہ خدائی بھونچال آتا ہے جس کو اسلام کہا گیا ہے تو اس کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے باہر کی دنیا اس سے باخبر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی اسلامی دعوت کا آغاز ہے۔

اسلامی دعوت فرد انسانی میں انقلاب لانے کی دعوت ہے نہ کہ کسی قسم کے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ میں کھیڑ پھاڑ کرنے کی۔ اسلامی انقلاب اصلاً ایک نفسیاتی انقلاب ہے اور نفسیاتی انقلاب کسی نفس ہی کے اندر وقوع میں آسکتا ہے۔ نفس کا وجود صرف ایک فرد میں ہوتا ہے اس لئے اسلام کی گھٹنا بھی ایک فرد ہی میں گھٹتی ہے۔ قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کا اپنا کوئی نفسیاتی وجود نہیں۔ اس لئے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے خالی فضا میں تیر مارنا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے قومی حالات یا کسی جغرافیہ کے تمدنی احوال لوگوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے درمیان ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے اندر ان کے قومی یا سیاسی حالات کے نتیجہ میں کوئی حرکت اٹھ کھڑی ہو تو اس کا نام اسلامی تحریک نہیں ہو جائے گا۔ اگر مسلمان اپنے قومی دشمن سے تصادم کو جہاد کہیں یا اپنی قومی تعمیر کو اسلامی نظام کی اصطلاحوں میں بیان کریں تو یہ اسلام نہیں بلکہ غیر اسلام کو اسلام کا نام دینا ہے جو آدمی کو صرف سزا کا مستحق بناتا ہے نہ یہ کہ اس کی بنا پر آدمی کو کوئی اسلامی انعام دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی اسلامی تحریکیں عظیم الشان پیمانہ پر اٹھیں مگر عملاً وہ اس طرح بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں جیسے خدا کے نزدیک ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کے سب قومی ہنگامے ہیں اور کسی قوم کے قومی ہنگاموں کا نام اسلام نہیں اسلامی دعوت کی تحریک ایک لفظ میں جنت کی طرف بلانے کی تحریک ہے۔ جنت خدا کی لطیف و نفیس دنیا ہے جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو اخلاق خداوندی کی سطح پر جئے ہوں، جنھوں نے دنیوی تعلقات میں کمال انسانیت کا ثبوت دیا ہو، جو خدا کی ابدی دنیا سے اثر لے کر متحرک ہوئے ہوں نہ کہ سیاسی اور معاشی حالات کے اثر سے۔ آج کی دنیا میں اسی کا چناؤ ہو رہا ہے۔ جو لوگ اپنی نفسیات اور کردار کے اعتبار سے جنتی ماحول میں بسانے کے قابل

ٹھہریں گے ان کو چھانٹ کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ تمام لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم کرکے دور پھینک دئے جائیں گے تاکہ ابدی طور پر تاریکیوں کے غار میں بھٹکتے رہیں۔

انسان کے سوا بقیہ دنیا بے حد حسین ہے۔ ہرے بھرے درختوں اور نرم و نازک پھولوں کو دیکھئے۔ زمین و آسمان کے قدرتی مناظر کا معائنہ کیجئے۔ ان کی بے پناہ کشش آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے گی کہ ان سے نظر ہٹانے کا جی نہ چاہے گا۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسانی دنیا ظلم اور گندگی کا کوڑا خانہ بنی ہوئی ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی سطح پر خدا کی مرضی براہ راست اپنی پوری شکل میں نافذ ہے، یہ دنیا ویسی ہی ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ اس کے برعکس انسان کو خدا نے آزادی دے دی ہے۔ اسی آزادی کے غلط استعمال نے انسانی دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام خوبیوں کا مالک صرف خدا ہے۔ خدا جہاں اپنے اختیار کو روک لے وہیں سے جہنم شروع ہو جاتی ہے اور خدا جب اپنے اختیار کو نافذ کر دے تو اسی کا نام جنت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا کہ انسان کو آزادی دے دی کہ وہ خدا کی حسین دنیا کو اپنی باغیانہ کارروائیوں سے عذاب خانہ بنا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ قیمتی انسان چنے نہیں جا سکتے تھے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ خدا کی وسیع دنیا اپنی ان گنت چیزوں کے ساتھ مکمل طور پر خدا کی اطاعت گزار ہے۔ حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک کوئی چیز بھی نہیں جو خدا کی مرضی سے ادنیٰ انحراف کرتی ہو۔ تاہم یہ تمام چیزیں اس لئے محکوم ہیں کہ وہ بے اختیار ہیں۔ فرماں برداری کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے لئے ممکن نہیں۔ اب خدا کو ایسی باشعور اور حقیقت پسند مخلوق درکار تھی جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائے۔ جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنا لے۔ یہی وہ انتہائی نادر ہستیاں ہیں جن کو چھانٹنے کے لئے خدا کا یہ عظیم کارخانہ آباد کیا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک انسانی ذہن کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی رہی ہے وہ انسان کی دنیا میں خرابی کا مسئلہ (Problem of Evil) ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں ساری انسانی تاریخ ظلم اور برائی کا رجسٹر معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنی آزادی کا انتہائی ظالمانہ استعمال کرتا ہے۔ مگر اتنی بڑی برائی کو خدا نے صرف اس لئے گوارا کیا کہ اس کے بغیر اس اعلیٰ نوع کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا تھا جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ اختیار اور آزادی کے ماحول ہی میں وہ انسان چنے جا سکتے ہیں جن کے متعلق خدا کے نگراں فرشتے یہ گواہی دیں کہ یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے مکمل اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو خدا کی خاطر بے اختیار کر لیا تھا۔ دنیا کی بے پناہ برائیاں دراصل ایک بے پناہ بھلائی کی قیمت ہیں۔ یہ بھلائی کہ انسانوں کے جنگل

سے وہ سعید روحیں چھان کر نکالی جائیں جو پورے شعور اور مکمل ارادہ کے ساتھ اپنے کو خدا کا محکوم بنالیں۔ جو محض حقیقت پسندی کی بنا پر خدا کی محکومی اختیار کریں نہ کہ مجبوری کی بنا پر۔

یہ وہ انوکھی ہستیاں ہیں جن کو یہ موقع تھا کہ وہ حق کو جھٹلا دیں مگر انھوں نے حق کو نہیں جھٹلایا۔ جن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی انا کا جھنڈا اونچا کریں۔ مگر وہ اپنے کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خدا کو صدر نشین بنانے پر راضی ہو گئے۔ جن کو پوری طرح یہ آزادی ملی ہوئی تھی کہ وہ اپنی قیادت اور اپنے مفادات کا گنبد کھڑا کریں مگر انھوں نے ہر "اپنے" کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیا اور صرف حق کا گنبد کھڑا کر کے انھوں نے خوشی حاصل کی۔ اس قسم کی نادر روحیں اس کے بغیر چنی نہیں جا سکتی تھیں کہ ان کو مکمل آزادی کے ماحول میں رکھا جائے اور آزادی کا حقیقی ماحول قائم کرنے کی ہر قیمت برداشت کی جائے ـــــ اسلامی دعوت کا مقصد ایسی ہی روحوں کو تلاش کرنا ہے

اسلامی انقلاب

دنیا میں سیاسی اور تمدنی انقلاب اسلامی دعوت کا براہ راست نشانہ نہیں۔ تاہم وہ اس کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ کسی معاشرہ میں جب قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی جمع ہو جائے جو اللہ کے لئے جینا اور اللہ کے لئے مرنا چاہتے ہوں تو قدرتی طور پر وقت کی سیاست اور تمدن پر انھیں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی سیاست یا اسلامی نظام نام ہے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کا جو اللہ کے آگے اپنے کو بے نفس کر چکے ہوں۔ جنھوں نے اپنی "میں" کو خدا کے عظیم تر "میں" میں گم کر دیا ہو۔ جن کے جذبات و احساسات آخرت سے اتنا زیادہ متعلق ہو جائیں کہ دنیا میں ان کا کوئی حوصلہ باقی نہ رہے جو دوسرے کے دل کے درد کو اپنے سینہ میں محسوس کرتے ہوں۔ ایسے ہی افراد اسلامی نظام قائم کرتے ہیں اور ایسے افراد اسی وقت بنتے ہیں جب کہ ہر قسم کے دنیوی مقصد سے بلند ہو کر خالص آخرت کے لئے تحریک چلائی جائے۔ اس کے برعکس اگر نعروں اور جلسوں کے زور پر کوئی انقلاب برپا کیا جائے تو وہ انقلاب نہیں ایک ہڑبونگ ہوگا جہاں اسلام کے نعرے تو بہت ہوں گے مگر اسلام کے عمل کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ ایسے لوگ حق کے تقاضوں کا نام لیں گے مگر عملاً اپنے گروہ کے تقاضوں کے سوا کوئی چیز ان کے سامنے نہ ہوگی۔ وہ انقلاب اسلامی کے ہنگامے برپا کریں گے مگر حقیقتہً ان کا مدعا یہ ہوگا کہ دوسروں کو تخت سے ہٹا کر خود اس پر قابض ہو جائیں۔ وہ انسانیت اور اخلاق کے نام پر جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچائیں گے مگر اس کا مقصود صرف یہ ہوگا کہ ایک خوبصورت عنوان پر اپنی قیادت کی شان قائم کریں۔ اسلامی انقلاب کی واحد لازمی شرط "بے میں" انسانوں کی فراہمی ہے اور موجودہ طرز کی تحریکوں سے سب سے کم جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ بلکہ سیاسی اور قومی انداز کی یہ تحریکیں تو "میں" کی غذا ہیں نہ کہ "میں" کی نفسیات کو ختم کرنے والی ـــــ خارجی انقلاب کو نشانہ بنانے والی تحریک افراد کے اندر کردار نہیں پیدا کر سکتی۔ کردار ہمیشہ ذاتی محرک سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ خارجی محرک سے۔

کوئی آدمی دوسرے کے لئے نہیں کماتا، اسی طرح کوئی آدمی بیرونی محرک کے لئے باکردار بھی نہیں بنتا۔ جو لوگ "نظام" کے نام افراد سے باکردار بننے کی اپیلیں کرتے ہیں وہ صرف اپنی سطحیت کا ثبوت دیتے ہیں اور دوسرے کے بارہ میں کمتر اندازہ

پیغمبر کا کام

اسلام کا مشن ایک ہی مشن ہے۔ اور وہ ہے توحید کا پیغام لوگوں تک پہنچانا۔ ایک ایک شخص کو موحد بنانے کی کوشش کرنا۔ یہی قدیم ترین زمانہ سے تمام نبیوں کا مشن تھا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام زمانوں میں توحید کی دعوت جان کی قربانی کی قیمت پر دینی ہوتی تھی۔ توحید کا پیغام لے کر اٹھنے والے آگ کے الاؤ میں ڈال دئے جاتے اور آروں سے چیر دئے جاتے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں شرک کو فکری غلبہ کا مقام حاصل تھا۔ حتیٰ کہ سیاست کی بنیاد بھی شرک پر قائم تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں کو یہ باور کرا کے ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ ان کے اندر خدا حلول کر آیا ہے۔ اس لئے جب توحید کا داعی یہ آواز بلند کرتا کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، تو قدیم زمانہ کے بادشاہوں کو یہ آواز براہ راست ان کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والی نظر آتی تھی۔ اس میں انھیں اپنی مشرکانہ سیاست کی تردید دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سیاسی مفاد کی بنا پر توحید کے داعیوں کے دشمن بن جاتے اور بے رحمی کے ساتھ ان کو کچل دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس صورت حال کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ قرآن میں پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کو سکھایا گیا کہ تم اس طرح دعا کرو: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا (خدایا ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے کے لوگوں پر ڈالا تھا)۔ یہ دعا کے انداز میں اس خدائی فیصلہ کا اظہار تھا کہ خدا انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لانے والا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتدار کا رشتہ شرک سے ٹوٹ جائے گا۔ اب حکومت ایک خالص سیاسی معاملہ ہوگا نہ کہ اعتقادی معاملہ۔ یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لئے قرآن میں حکم دیا گیا: وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله (انفال ۳۹) یعنی مشرکوں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ کی حالت باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے۔

فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ فَتَنَ فلاناً عن رأيه کے معنی ہیں رائے سے پھیر دینا۔ قرآن میں آیا ہے: موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے جن کو اندیشہ تھا کہ فرعون ان کو ستائے گا (یونس ۸۳) اس آیت میں ان یفتنہم کا لفظ ہے جو ستانے اور عذاب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ گویا فتنہ کے معنی تقریباً وہی ہیں جس کو انگریزی زبان میں Persecution کہتے ہیں۔ یعنی کوئی رائے یا عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فتنہ تھا جس کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ شرک کا فتنہ تھا۔ چنانچہ مفسرین نے ان آیات میں فتنہ کی تفسیر "شرک" سے کی ہے۔ تاہم یہاں فتنہ سے مراد مطلق شرک نہیں بلکہ شرک جارح ہے۔ کیونکہ شرک جب جارح ہو تبھی وہ روکنے والا بنتا ہے۔ حتیٰ لا تکون فتنۃ کا مطلب ہے حتی لا یُفْتَنَ رجلٌ عن دینہ۔ یعنی شرکِ جارح سے لڑکر اسے ختم کردو تاکہ دین شرک بے زور اور مغلوب ہوکر رہ جائے اور غالب دین کی حیثیت سے صرف دینِ توحید دنیا میں باقی رہے۔

شرک اپنی ابتدائی صورت میں محض ایک عقیدہ ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں اس نے "فتنہ" کا مقام حاصل کرلیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں انسانی فکر پر شرک کا غلبہ تھا۔ زندگی کے ہر معاملہ کو شرک کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ سیاست و حکومت کی بنیاد بھی شرک کے اوپر قائم تھی۔ لوگ سورج اور چاند جیسی چیزوں کو دیوتا سمجھتے تھے اور شاہی خاندان اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کی اولاد بتاکر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس بنا پر جب توحید کا داعی یہ کہتا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو قدیم بادشاہوں کو یہ نظریہ ان کے حق حکمرانی کی تردید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ اس کو اپنا حریف سمجھ کر اس کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ عرب میں اور اطرافِ عرب میں توحید کی بنیاد پر جو اسلامی انقلاب آیا اس نے شرک کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹا دیا۔ اب شرک کی حیثیت ایک ذاتی عقیدہ کی ہوگئی نہ کہ ایک ایسے عوامی نظریہ کی جس کے اوپر سماجی زندگی کا پورا انظام قائم ہو۔ نتیجۃً شرک کا رشتہ اقتدار سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اب شرک کی بنیاد پر کسی کے لئے حق حکمرانی کا دعویٰ کرنے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔

معلوم انسانی تاریخ میں یہ تبدیلی بالکل پہلی بار آئی۔ اس کے ہمہ گیر اثرات میں سے دو چیزیں یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ جب یہ معلوم ہوا کہ خدا صرف ایک ہے اور بقیہ تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر مظاہر فطرت کے تقدس کا ذہن ختم ہوگیا۔ وہ چیزیں جو اب تک انسان کے لئے پرستش کا عنوان بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس کو اپنی خادم نظر آنے لگیں (خلق لکم ما فی الارض جمیعا، بقرہ ۲۹) اب آدمی نے چاہا کہ وہ ان چیزوں کو جانے اور ان کو استعمال کرے۔ انسانی ذہن کی یہی وہ تبدیلی ہے جس نے تاریخ میں توہماتی دور کو ختم کرکے سائنس کے دور کو شروع کیا۔ اسی کے ساتھ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت کا دور کم از کم نظریاتی طور پر ختم ہوگیا اور عوامی حکمرانی کے دور کا آغاز ہوا۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ تمام انسان یکساں ہیں، کسی انسان کے اندر کوئی خدائی صفت نہیں تو اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر خدائی حق حکمرانی کے لئے زمین باقی نہیں رہی۔

ان دونوں انقلابات کا آغاز مدینہ سے ہوگیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمشق، بغداد، اسپین اور سسلی ہوتا ہوا

قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ اس مدت میں قدیم حالات کے اثر سے اس فکری تحریک کو بار بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس کا سفر جاری رہا۔ مخالف طاقتوں کی کوئی بھی کوشش اس میں کامیاب نہ ہو سکی کہ وہ مظاہر فطرت کے تقدس کے دور کو دوبارہ اس کی سابقہ عظمت کے ساتھ واپس لا سکے۔ اور نہ کسی حکمراں کے لئے کبھی یہ ممکن ہوا کہ وہ اس طرح مقدس بادشاہ ہونے کا مقام حاصل کرے جیسا کہ عراق کے نمرود اور مصر کے فرعون کو قدیم زمانہ میں حاصل تھا۔

مسلم دنیا سے مغربی دنیا کی طرف

ابتداءً تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمل مسلم دنیا میں ہوتا رہا۔ مگر سولھویں صدی عیسوی میں ایک نیا انقلاب آیا۔ مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کی وجہ سے ایک طرف بغداد کی عباسی خلافت ٹوٹ گئی اور دوسری طرف اسی باہمی اختلاف کے نتیجہ میں اسپین کا مسلم اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلم دنیا میں کوئی ادارہ ان لوگوں کی سرپرستی کرنے والا نہ رہا جو علمی و فکری تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ علماء اور مفکرین کی بڑی تعداد دھیرے دھیرے اٹلی اور فرانس کی طرف منتقل ہو گئی۔ مخصوص اسباب کی بنا پر یورپ میں ان لوگوں کو بہت پذیرائی ملی۔ انقلابی عمل جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا، وہ یورپ کی دنیا میں ہونے لگا۔ تاہم یورپ پہنچ کر اس کے اندر ایک تبدیلی آگئی۔ مسلم دنیا میں یہ کام اسلام کے زیر اثر ہو رہا تھا، یورپ کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی، اس نے اس کو اسلام سے جدا کر کے خالص علمی حیثیت سے فروغ دینا شروع کیا۔ اگرچہ مسلم علوم اور عربی زبان کی اس منتقلی کا اثر یورپ کے مسیحی عقائد پر بھی پڑا۔ حتیٰ کہ مارٹن لوتھر (۱۵۴۶ — ۱۴۸۳) براہ راست طور پر یورپ کے اوپر اسلامی اثرات کی پیداوار تھا۔ تاہم علمی و فکری تحریک کا ارتقاء یورپ میں آزاد سیکولر شعبہ کے طور پر ہوا نہ کہ مذہب کے ایک ذیلی شعبہ کے طور پر۔ جدید مغرب کا سائنسی اور جمہوری انقلاب تمام تر اسلامی انقلاب کی دین ہے۔ البتہ مغرب نے اس کو مذہب سے جدا کر کے سیکولر شکل دے دی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید مغربی انقلاب، اسلامی انقلاب کی ایک دنیوی صورت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایٹم بم آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی فوجی صورت ہے اور قومی ملکیت مارکسی نظریہ کی معاشی صورت۔

جدید انقلاب کی اسلامی اہمیت

جدید مغربی انقلاب، اپنی عمومی حیثیت میں، خود اسلام کا پیدا کردہ تھا۔ اس کے نتائج اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھے۔ اس انقلاب نے دنیوی اعتبار سے اس دعا کی تکمیل کر دی تھی جس کو خدا نے ان الفاظ میں ہمیں تلقین کیا تھا: اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا (بقرہ) اس انقلاب کے نتیجہ میں زندگی کے نظام میں ہمارے موافق جو تبدیلیاں ہوئیں وہ خاص طور پر یہ تھیں:

۱۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھاکر حکومت کرتے تھے کہ وہ سورج دیوتا یا چاند دیوتا کی اولاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں توحید کی دعوت فوراً سیاسی اقتدار کی حریف بن جاتی تھی اور مشرک بادشاہوں کے ظلم کا نشانہ بنتی تھی۔ شرک کی تردید کو وہ اپنے حق حکمرانی کی تردید کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے طور پر یورپ میں جو جمہوری انقلاب آیا ہے اس نے اس نزاکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کیونکہ آج کا حکمراں عوامی رائے سے حکمرانی کا حق حاصل کرتا ہے نہ کہ خدا کے ساتھ اپنا مفروضہ الوہی رشتہ جوڑ کر۔ اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان کھول دیا کہ توحید کی تبلیغ اس اندیشہ کے بغیر کی جائے کہ پہلے ہی مرحلہ میں غیر ضروری طور پر اس کا ٹکراؤ سیاسی ادارہ سے ہو جائے اور وہ اس کو کچل کر رکھ دے، جیسا کہ اسلام سے پہلے ساری تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔

۲۔ قدیم زمانہ میں مظاہر فطرت (سورج، چاند، دریا وغیرہ) کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ توحید کی بنیاد پر ہونے والے اسلامی انقلاب اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے مغرب کے سائنسی انقلاب کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کے واقعات خدائی مظاہر کے بجائے عام مادی مظاہر سمجھے جانے لگے۔ جو چیز پہلے پوجنے کی چیز سمجھی جاتی تھی وہ اب تحقیق و تجسس کی چیز بن گئی۔ اس کے نتیجہ میں جدید سائنسی اور تکنکی انقلاب پیدا ہوا جس نے بے شمار نئی طاقتیں انسان کے قبضہ میں دے دیں۔ اس انقلاب کے ذریعہ تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں اور جدید ذرائع ابلاغ (پریس، ریڈیو وغیرہ) تک انسان کی دسترس ہوئی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہو گیا کہ کسی عقیدہ کی تبلیغ عالمی اور بین اقوامی سطح پر کی جا سکے۔ خدا کے دین کی دعوت مقامی دعوت کے مرحلہ سے گزر کر عالمی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔

۳۔ اسی انقلاب کے ذریعہ کائنات کے وہ چھپے ہوئے حقائق سامنے آئے جو توحید اور اس سے متعلق نظریات کے حق میں اعلیٰ علمی دلائل فراہم کر رہے ہیں۔ جنھوں نے قرآن کے کائناتی اشاروں کو کھول کر ہر ایک کے لئے انھیں قابل فہم بنا دیا ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار وہ دور آیا جب کہ کائناتی نشانیاں معجزہ کا بدل بن جائیں۔ دینی حقیقتوں کو مشاہداتی دلائل کی سطح پر ثابت کیا جا سکے۔

۴۔ پھر اسی انقلاب کے ذریعہ تاریخ میں پہلی بار معاملات پر غور و فکر کا سائنسی، بالفاظ دیگر، واقعاتی نقطہ نظر پیدا ہوا۔ کائنات کا علم صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب کہ انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں اس پر غور کیا جائے۔ اس لئے اس کے اثر سے علمی دنیا میں یہی عام ذہن بن گیا۔ اب واقعات کو واقعات کی رو سے دیکھا جانے لگا نہ کہ خوش عقیدگی یا توہمات کے اعتبار سے۔ اب یہ فضا پیدا ہوئی کہ مذاہب کی خالص علمی اور تاریخی تحقیق کی جائے۔ اسی انداز مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں علمی سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اسلام کے سوا جتنے

مذاہب ہیں سب کے سب غیر تاریخی (اور اس بنا پر ناقابل اعتبار) ہیں۔ مذاہب کے درمیان جس مذہب کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل ہے وہ صرف اسلام ہے (ملاحظہ ہو دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس)

مغرب کا غلبہ مسلم دنیا پر

مسلم دنیا نے صلیبی جنگوں (۱۲۷۱۔ ۱۰۹۵) میں مسیحی یورپ پر فتح پائی تھی۔ مگر اس فتح کے بعد ہی برعکس عمل بھی شروع ہوگیا۔ مسیحی یورپ نے محسوس کیا کہ اس کی شکست کا سبب علمی اور فکری میدان میں مسلم دنیا سے اس کا پیچھے ہونا تھا۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ نے تیزی سے مسلمانوں کے علوم اور عربی زبان کو سیکھنا شروع کر دیا۔ بعد کی صدیوں میں جب مسلم دنیا کے اہل علم یورپ کے ملکوں میں منتقل ہوئے تو وہاں یہ عمل اور تیزی سے جاری ہوگیا۔ بالآخر مغرب کی ترقی اس نوبت کو پہنچی کہ وہ علم وعمل کے تمام شعبوں میں مسلم قوموں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس نے مسلم ممالک میں داخل ہونا شروع کیا اور انیسویں صدی تک یہ حال ہوا کہ تقریباً تمام مسلم دنیا پر مغربی قوموں کا تسلط قائم ہوگیا۔

یہی سیاسی حادثہ اس بات کا سبب بن گیا کہ مذکورہ قیمتی امکانات اسلامی دعوت کے حق میں استعمال نہ ہوسکیں۔ صلیبی جنگوں میں ہاری ہوئی قوموں کو دوبارہ مسلم علاقوں میں گھستے ہوئے دیکھ کر لوگ بھڑ اٹھے۔ ساری مسلم دنیا میں مغرب کے خلاف سیاسی زور آزمائی شروع ہوگئی۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگ سیاسی مقابلہ آرائی ہی کو عین اسلام ثابت کرنے لگے تاکہ لوگ جب اجنبی حکمرانوں سے لڑکر فارغ ہوں تو خود اپنے ملکی حکمرانوں کے خلاف مقدس سیاسی جہاد چھیڑ دیں۔ اس فضا میں کسی کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ جدید دنیا نے کچھ نئے امکانات کھولے ہیں اور وہ اسلام کے حق میں کامیابی کے ساتھ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جدید مواقع انتظار کرتے رہے کہ ہم ان کو استعمال کر کے اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پھیلا دیں اور نتیجۃً خدا کی نصرت کے مستحق ہوں۔ مگر ہماری سیاسی نفسیات نے ہم کو اُدھر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ دی۔

سیاسی انقلاب کی نوعیت

سیاسی انقلاب کی اہمیت اسلام میں کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سیاسی انقلاب دراصل اس کا نام ہے کہ اہلِ حق کو اہلِ باطل پر غلبہ حاصل ہو جائے (الصف) قرآن کی صراحت کے مطابق یہ غلبہ خدا کی توفیق اور نصرت سے حاصل ہوتا ہے (وما النصر الا من عند اللہ) اور خدا کی نصرت کا استحقاق حاصل کرنے کی واحد لازمی شرط دعوت ہے۔ اہل حق جب دعوت کے عمل کو اس کی تمام صالح شرائط کے ساتھ شروع کریں اور اس کو کرتے ہوئے اتمام حجت کے قریب پہنچا دیں تو اس وقت اس دعوتی عمل کی تکمیل کے نتیجہ میں ایک طرف اہلِ حق انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اہل باطل سزا کے مستحق۔ اس وقت خدائی منصوبہ کے تحت حالات میں تبدیلی

شروع ہوجاتی ہے۔ اہلِ حق خدائی طاقت سے مسلح ہو کر اہلِ باطل پر غالب آتے ہیں۔ دعوت حق اور اتمام حجت کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں سے کبھی کسی مسلم گروہ کو غیر مسلم طاقتوں پر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ خدا کی سنت ہے اور خدا کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (انعام ۱۳۱)

غیر مسلم اقوام کے لئے غلبہ کا فیصلہ خدا کے عام قانونِ امتحان کے تحت ہوتا ہے (یونس ۱۴) مگر اہلِ ایمان کے لئے غلبہ کا فیصلہ قانون اتمام حجت کے تحت ہوتا ہے۔ اگر ہم غیر مسلم گروہ پر دعوتی عمل کو انجام نہ دیں تو ہم کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہئے کہ غیر مسلم گروہ پر ہمیں غلبہ عطا کیا جائے گا۔ دعوتی عمل ہی تو غیر مسلم گروہ پر غلبہ کی قیمت ہے۔ پھر جب قیمت ادا نہ کی گئی ہو تو متاع مطلوب آخر کس طرح حاصل ہو گی۔

مسلم دنیا میں سیاسی ردعمل

چودھویں صدی ہجری کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ انیسویں صدی عیسوی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے چودھویں صدی ہجری اسلامی تاریخ کی اہم ترین صدی تھی۔ کیوں کہ یہ اس وقت آئی جب کہ اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہونے والا عمل اپنی آخری تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ گیا تھا۔ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جس عالمی ہدایت کا دروازہ کھولا تھا، اس کو بروئے کار لانے کے حالات اور ضروری وسائل اپنی کامل صورت میں مہیا ہو کر ہمارے سامنے آچکے تھے۔ مگر تاریخ کا غالباً یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ یہ دروازہ عین اس وقت خود مسلمانوں کے ہاتھوں بند ہو گیا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں کھولا تھا۔

جدید انقلاب نے یورپ کو جو طاقتیں دی تھیں ان کو اس نے اسی طرح اپنے قومی عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جس طرح کوئی بھی قوم ان حالات میں کرتی ہے۔ مغربی قوموں کی دسترس جیسے ہی جدید طاقتوں پر ہوئی ان کے یہاں وہ چیز وجود میں آئی جس کو مغربی استعمار کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے جغرافیہ سے نکل کر خشکی اور تری میں اپنے جھنڈے گاڑے۔ قوموں کے درمیان اپنی تہذیب پھیلائی۔ جن لوگوں نے ان کے راستہ میں رکاوٹ ڈالی ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ مغربی قوموں کے ان عزائم کا براہ راست شکار ہونے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے باہر اکثر آباد دنیا مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیز جس کو ہم نے اسلامی انقلاب کا سیکولر نتیجہ کہا ہے، اس کا تعارف مسلمانوں سے اپنے پہلے ہی مرحلہ میں اس حیثیت سے ہوا گویا کہ وہ ایک دشمن طاقت ہے جو مسلمانوں کو ان کی تمام عظمتوں سے محروم کر کے ان کو ایک مغلوب اور پسماندہ قوم بنا دینا چاہتی ہے۔ مغربی انقلاب کا افادی پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، وہ اس کو اپنے سیاسی اور اقتصادی حریف کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔

چودھویں صدی ہجری اسلام کی پوری تاریخ میں پہلی صدی تھی جب کہ یہ امکان پیدا ہوا تھا کہ اسلام

کی دعوت توحید کو یُسر (آسانی) کے حالات میں انجام دیا جائے جب کہ اس سے پہلے صرف عُسر (سختی) کے حالات ہی میں اس کو انجام دینا ممکن ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی پہلی بار ہوا کہ خود انسان کے اپنے مسلّمات کے مطابق اسلام کا دیگر ادیان کے مقابلہ میں واحد معتبر دین ہونا ثابت کیا جائے اور اس کو اعلیٰ ترین علمی شواہد سے اس طرح مدلّل کر دیا جائے کہ کسی کے لئے انکار کی جرأت باقی نہ رہے۔ نیز اس صدی میں پہلی بار تیز رفتار سواریاں اور تبلیغ کے جدید ذرائع انسان کے قبضہ میں آئے جن سے کام لے کر اسلام کے پیغام کو بین اقوامی سطح پر پھیلایا جا سکتا تھا۔ مگر جو قومیں ان خدائی برکتوں کو ہماری طرف لا رہی تھیں وہ اتفاقی حالات کے نتیجہ میں ہماری سیاسی حریف بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا مغرب کے بارے میں مخالفانہ نفسیات کا شکار ہو گئی، مغرب کی طرف سے آنے والے انقلاب کا افادی پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ حالاں کہ خدا نے مسلمانوں کے لئے ایسا امکان کھولا تھا کہ وہ خود مغرب کے پیدا کردہ حالات کو اپنے دعوتی مقاصد میں استعمال کر کے مغرب کو نظریاتی طور پر فتح کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں نے بروقت اس دانش مندی کا ثبوت دیا ہوتا تو چودھویں صدی ہجری میں وہ واقعہ دوبارہ نئے انداز سے پیش آتا جو آٹھویں صدی ہجری میں تاتاری فاتحین کے خادمانِ اسلام بن جانے کی صورت میں پیش آ چکا ہے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

چودھویں صدی ہجری میں ساری مسلم دنیا میں بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں۔ مگر ضمنی فرق کے باوجود یہ تمام تحریکیں ردِ عمل کی تحریکیں تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں مثبت تحریکیں۔ جدید مسلم قیادت "مغرب" کے نام سے جس چیز سے واقف ہوئی وہ صرف یہ تھا کہ یہ ایک حملہ آور قوم ہے جو ہمارے لئے سیاسی چیلنج بن کر اٹھی ہے، وہ اس بات سے بے خبر رہے کہ مغرب دراصل کچھ جدید قوتوں کی دریافت کا نام ہے اور یہ قوتیں اسلام کے لئے عین مفید ہیں بلکہ بالواسطہ طور پر خود اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلم تحریکیں نئے امکانات سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، وہ جدید قوموں کے مقابلہ میں صرف ایک منفی رول ادا کر کے رہ گئیں۔

اس صورت حال کا مزید نقصان یہ ہوا کہ دوسری قوموں سے ہمارا صحیح اسلامی رشتہ قائم نہ ہو سکا مسلمان کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مذکورہ منفی نفسیات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے ان قوموں کو مدعو نہ سمجھا، ان کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ اسلامی تحریکیں پیغام آخرت کی تحریکیں نہ رہیں بلکہ پیغام سیاست کی تحریکیں بن گئیں۔ ان تحریکوں نے انداز کے فرق کے ساتھ، جدید دنیا کو جس "اسلام" سے واقف کرایا وہ محض ایک قسم کا قومی اسلام تھا نہ کہ خدا کا وہ دین جو انسانوں کو آخرت کی ابدی کامیابی کا راستہ دکھانے کے لئے آیا ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق حریف اور مدمقابل کا تعلق بن کر رہ گیا۔

یہ مسلم تحریکیں اپنی جس معذوری کی وجہ سے "مغرب بحیثیت استعمار" اور "مغرب بحیثیت جدید قوت" کو الگ الگ کرکے نہ دیکھ سکیں، اسی معذوری کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ انھوں نے جدید قوموں کے خلاف اپنی مہم میں نہ تو نئی قوتیں فراہم کیں اور نہ نئے حالات کی رعایت کی۔ حد درجہ نادانی کے ساتھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جان و مال کی قربانیاں دی جاتی رہیں جب کہ ان قربانیوں کے لئے قطعی طور پر مقدر تھا کہ اسباب کی اس دنیا میں وہ بالکل رائگاں ہو کر رہ جائیں۔ اس طویل غیر حقیقت پسندانہ سیاست کی اب یہ نفسیاتی قیمت مسلمانوں کو دینی پڑ رہی ہے کہ پوری کی پوری مسلم دنیا ایک قسم کے فرضی جنونِ عظمت (Paranoia) کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور اب کوئی حقیقت پسندانہ بات اسے اپیل ہی نہیں کرتی۔

فخر نہیں ذمہ داری

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے یکم اکتوبر ۱۹۸۰ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی۔ ان کی ڈیڑھ گھنٹہ کی یہ تقریر ان کے اپنے الفاظ میں دنیا بھر کے ۹۰ کروڑ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے تھی۔ ان کی لکھی ہوئی تقریر کا ایک پیراگراف یہ تھا:

> As they enter the 15th Century Hijra, the Islamic peoples, who have rediscovered their pride in their religion, their great culture and their unique social and economic institutions, are confident that the advent of this century would mark the beginning of a new epoch, when their high ideals of peace, justice, equality of man, and their unique understanding of the universe, would once again enable them to make a worthy contribution to the betterment of mankind.

اب کہ اسلامی قومیں پندرھویں صدی ہجری میں داخل ہو رہی ہیں، انھوں نے اپنے مذہب، اپنے عظیم کلچر اور اپنے بے مثل سماجی اور معاشی اداروں میں اپنے فخر کو دوبارہ دریافت کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ اس صدی کا آغاز ایک نئے عہد کی ابتدا ثابت ہوگا جب کہ امن، انصاف، انسانی برابری اور کائنات کے بارے میں ان کا بے مثل شعور ان کو دوبارہ اس قابل بنائے گا کہ وہ انسانیت کی بھلائی میں قابل قدر حصہ ادا کر سکیں۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے یہ بات موجودہ مسلمانوں کی تعریف کے طور پر کہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی میں مسلمانوں کا وہ المیہ بھی چھپا ہوا ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ان کی تمام اسلامی کوششوں کو بے قیمت بنا دیا ہے۔ آج ساری مسلم دنیا میں اسلام کے نام پر زبردست سرگرمیاں جاری ہیں مگر یہ ساری دھوم فخر (Pride) کے طور پر ہے نہ کہ ذمہ داری کے طور پر۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سرگرمی فخر کے احساس کی بنیاد پر اٹھتی ہے (حدید ۲۰) اور اخروی سرگرمی عبدیت کے احساس کی بنیاد پر (ذاریات ۵۶) فخر سے انانیت اور مطالبہ کا جذبہ ابھرتا ہے اور عبدیت سے عجز اور ذمہ داری کا۔ اسلامی تحریک وہ ہے جو جہنم سے ڈرانے کے لئے اٹھے۔ مگر موجودہ زمانہ کی

اسلامی تحریکیں دنیا میں بڑائی حاصل کرنے کے جذبہ سے اٹھی ہیں۔ قومی سربلندی کے احساس نے ان کو کھڑا کیا ہے۔ آج کے مسلمانوں کے لئے اسلام ایک ناز کی چیز ہے نہ کہ حقیقۃً آخرت کی صراط مستقیم۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ تحریکیں مسلمانوں کی قومی تحریکیں ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تحریکیں۔ مسلمانوں کے یہاں آج جس مذہب کی دھوم ہے وہ قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب۔ کیونکہ قومی مذہب سے ہمیشہ فخر کی نفسیات ابھرتی ہے اور خدائی مذہب سے ذمہ داری کی نفسیات۔

حقیقی اسلام آدمی کے اندر عجز اور تواضع پیدا کرتا ہے اور جہاں عجز اور تواضع ہو وہاں گویا ساری بھلائیاں جمع ہو گئیں۔ کیونکہ ہر خرابی کی جڑ کبر اور ہر اچھائی کی جڑ عجز ہے۔ ایسے افراد میں ان کے اسلام کے لازمی نتیجہ کے طور پر خدا کا خوف، آخرت کی طلب، باہمی اتحاد، ایک دوسرے کی خیر خواہی، شکایتوں سے درگزر کرنا، تعمیری کاموں کی طرف توجہ اور حقوق کے مقابلہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اور جس سماج میں ایسی نفسیات والے انسان قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں وہ اپنے آپ دنیا میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس قومی اسلام آدمی کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتا ہے اور جہاں فخر و ناز کے جذبات ہوں وہاں گویا تمام برائیاں جمع ہو گئیں۔ ایسے افراد کے اندر انانیت، آخرت سے بے خوفی، اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کا احتساب اور پھر ان کیفیات کے نتیجہ میں اختلاف اور باہمی ٹکراؤ عام ہو جاتا ہے۔ وہ خاموش تعمیری کام کے مقابلہ میں نمائشی کاموں کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ وہ پیچھے چلنے کے بجائے ہمیشہ آگے چلنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے معمولی کام کو بڑے بڑے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تاکہ اپنے برتری کے جذبہ کو تسکین دے سکیں۔ اسلام ایسے لوگوں کے درمیان کرنے سے زیادہ کہنے کی چیز ہوتا ہے — اور جہاں ایسا اسلام ہو وہاں لوگوں کے اوپر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے نہ کہ خدا کی رحمت و نصرت۔

یہودیوں کی صہیونی تحریک قدیم اسرائیلی عظمت کو واپس لانے کی تحریک ہے۔ ہندوؤں کی آر ایس ایس تنظیم اپنے شاندار ماضی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اٹھی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی ایک پُر فخر دنیوی تاریخ ہے اور موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکیں کسی نہ کسی اعتبار سے اسی پر فخر ماضی کو واپس لانے کے جذبہ سے ابھری ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہودیوں اور ہندوؤں کی تحریکیں مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود حقیقی معنوں میں مذہبی تحریکیں نہیں ہیں، وہ یقینی طور پر صرف قومی تحریکیں ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی اسی قسم کے جذبات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں بھی محض اس لئے اسلامی تحریکیں نہیں بن جائیں گی کہ وہ اپنے مقصد کو اسلامی الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ خدا کسی کے عمل کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے نہ کہ ظاہر کے اعتبار سے۔ جو تحریک قومی نفسیات کے ساتھ اٹھے وہ خدا کی نظر میں قومی تحریک ہی رہے گی، اس کا قرآن و حدیث کے الفاظ استعمال کرنا کسی بھی طرح اس کو اسلامی

تحریک کا مقام نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس پر خدا کے وہ وعدے پورے ہو سکتے جو صرف حقیقی اسلامی تحریک کے لئے مقدر ہیں۔

ایک حقیقی درخت خود اپنے بیج سے اگتا ہے نہ کہ پلاسٹک کے ہم شکل بیج سے۔ اسی طرح وہی اسلامی تحریک خدا کے وعدہ کئے ہوئے نتائج تک پہنچتی ہے جو حقیقی اسلامی بنیادوں پر اٹھی ہو۔ ایک تحریک جو حقیقتاً قومی محرکات کے تحت اٹھے وہ صرف اس لئے اسلامی نتائج ظاہر نہیں کرنے لگے گی کہ اس کے رہنما جب اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو وہ اس کو اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلات میں بیان کرتے ہیں۔

اسلامی تحریک دراصل معرفت خداوندی کا عملی اظہار ہے۔ وہ آخرت کے نظام کو دنیا کی زندگی میں اتار لانا ہے۔ خدا نے بقیہ کائنات میں جن اخلاقیات کو بزور قائم کر رکھا ہے انھیں اخلاقیات کو انسان کی سطح پر خود اپنے ارادے سے قائم کرنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی تحریک ایک ابدی حقیقت کے زیر اثر اٹھنے والی تحریک ہے نہ کہ ایسی تحریک جو قومی واقعات کے وقتی ردعمل کے طور پر ظہور میں آئی ہو۔

مومن خدا کی زمین میں اُگنے والا خدا کا سرسبز درخت ہے۔ اور مومنین کی جماعت خدا کا سرسبز باغ۔ جو لوگ وقتی تماشوں یا قومی ہنگاموں کو اسلامی دعوت کا نام دیتے ہیں وہ گویا اپنے ٹھنٹھ کو خدا کا سرسبز باغ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کے نام پر استغلال کرنے کے مجرم ہیں، وہ اپنے اس عمل کے لئے کسی کریڈٹ کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

غلبۂ اسلام

اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا سوال آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ ابھرا ہوا سوال ہے۔ مگر اس سلسلے میں ان کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب سے ان کے اندر عظمت ماضی کو دوبارہ واپس لانے کی ایک مجہول خواہش تو ضرور پیدا ہوگئی ہے مگر ماضی کی تاریخ کو حال کا واقعہ بنانے کے لئے جو ضروری عمل درکار ہے اس کا واضح شعور انھیں حاصل نہیں۔

ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو فضائل اسلام کی طلسماتی کہانیاں سنا کر مسجدوں کی آبادی میں اضافہ کرو، اور اس کے بعد ساری دنیا اپنے آپ تمھاری ہو جائے گی۔ مگر یہ حل ایسا ہی ہے جیسے ٹونے ٹوٹکے کے ذریعہ ہمالیہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کی امید قائم کر لی جائے۔ دوسرا طبقہ پر جوش تقریریں کرنے اور شاعرانہ الفاظ بولنے کو مسئلہ کا حل سمجھتا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ خدا کی دنیا محکم قوانین کی دنیا ہے۔ یہاں لفظوں کا کمال دکھا کر کسی واقعہ کو ظہور میں نہیں لایا جا سکتا۔ ایک اور طبقہ اس انقلابی غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اپنے کسی بادشاہ کو تخت سے اتار کر یا اپنے کسی حکمراں کو پھانسی پر چڑھا کر وہ اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ یہ مسئلہ عالمی طاقتوں کو زیر کرنے کا مسئلہ ہے نہ کہ قوم کے کچھ افراد کو اسلام دشمنی کی "علامت" ٹھہرا کر ان کو کسی نہ کسی تدبیر سے ہلاک کر دینے کا۔

تبدیلی اقتدار کا قانون

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حکومت کا مالک اللہ ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے (آل عمران ۲۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کسی گروہ کا غلبہ و اقتدار حاصل کرنا کوئی سادہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ براہ راست خدا کے فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایک گروہ کا غلبہ ہمیشہ دوسرے گروہ کی مغلوبیت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایسے ایک واقعہ کے ظہور کے لئے خارجی دنیا میں ایسی وسیع تر تبدیلیوں کا پیش آنا ضروری ہے جو ایک گروہ کے حق میں حالات کو موافق کر دیں اور دوسرے گروہ کے حق میں اس کو مخالف بنا دیں۔

اجتماعی زندگی میں اس قسم کا غیر معمولی تغیر ہمیشہ مافوق اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ انقلاب خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، ہمیشہ ان اسباب کے زیر اثر آتا ہے جو کبھی کسی شخص یا جماعت کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ روس کا اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) پہلی جنگ عظیم کے پیدا کردہ ہنگامی حالات کے بطن سے نکلا۔ موجودہ صدی کے وسط میں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی مغربی استعمار سے آزادی دوسری جنگ

عظیم کے پیدا کئے ہوئے ہنگامی حالات کے اندر سے برآمد ہوئی۔ جب کہ اس قسم کی عالمی جنگ کو برپا کرنا نہ اشتراکی تحریک کے اختیار میں تھا اور نہ وطنی آزادی کی تحریک کے اختیار میں۔ اسی طرح دور اول میں مسلمانوں کی تیز فتوحات کا خاص سبب یہ تھا کہ ایران و روم کی سلطنتیں عین اسی زمانہ میں لمبی لڑائیاں لڑکر بالکل کمزور ہو چکی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ وقت کی دو سب سے بڑی طاقتوں کے درمیان اس قسم کی تباہ کن جنگ چھیڑنا صرف خدا کے اختیار میں تھا نہ کہ کسی انسان کے اختیار میں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عام قوموں کے درمیان سیاسی تبدیلیاں خدا کے قانون دفع (البقرہ ۲۵۱) کے تحت ظہور میں آتی ہیں۔ یعنی ایک ظالم اور مفسد کی سیاسی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے اس کی جگہ کسی دوسرے کو لے آنا، ایک گروہ کے ذریعہ کسی دوسرے گروہ کو ہٹا دینا۔ بالفاظ دیگر، عام سیاسی تبدیلیاں زیادہ تر سلبی مقصد کے تحت ہوتی ہیں۔ مگر جہاں تک اسلامی انقلاب کا تعلق ہے وہ ایجابی مقصد کے تحت وقوع میں آتا ہے۔ اسلامی انقلاب اس لئے برپا کیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے ان خاص بندوں پر احسان کرے جنھوں نے خدا کے مطلوبہ معیار کے مطابق اپنے شعور اور اپنے کردار میں صالحیت کا ثبوت دے دیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (النور ۵۵)	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ ان لوگوں کو حکومت دی جو ان سے پہلے گزرے۔ اور ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا مسئلہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے کہ وہ عام طرز کی سیاسی یا غیر سیاسی تدبیروں سے وقوع میں آجائے۔ یہ کفر و شرک کی عالمی بالادستی کو ختم کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ غالب تہذیب کو مغلوب کرنے اور مغلوب تہذیب کو دوبارہ غلبہ کا مقام دینے کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک تاریخی دور کو ختم کر کے دوسرا تاریخی دور واپس لانے کا مسئلہ ہے۔ مختصر الفاظ میں، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے خدائی طاقتوں کی کارفرمائی درکار ہے۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ایک طوفان نوح برپا ہو جس میں شیطان کی تمام نسل غرق ہو کر رہ جائے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ معجزۂ موسوی ظاہر ہو جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمندر کی موجوں کے حوالے کردے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ خدا کے فرشتے آسمان سے اتریں اور "بدر" کے میدان میں وقت کے تمام بڑوں کو جمع کر کے انھیں مسلمانوں کے قبضہ میں دے دیں۔ یہ واقعہ خدائی مدد سے ظہور میں آنے والا واقعہ ہے۔

مسلمان صرف اپنی محدود کوششوں سے اس کو بر روئے کار نہیں لاسکتے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا قافلہ اپنے ہی قدموں پر چل کر آگے بڑھے گا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے لئے زینہ خدا کی طرف سے فراہم ہوگا جس سے چھلانگ لگا کر وہ اپنی منزل تک پہنچ جائیں ۔ حالات میں اس قسم کی غیرمعمولی تبدیلی کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کا اہتمام ہمیشہ کائنات کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔

آج مسلمان جس مغلوبیت کی حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی سبیل محض معمول کی تحریکی کوششوں میں نہیں ہے بلکہ غیرمعمولی حالات کے ظہور میں ہے۔ ہمارے حوصلوں کی کامیابی کا امکان صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب کہ خدائی مداخلت ہماری جدوجہد کو ہمارے لئے سازگار بنادے۔ جب زمین و آسمان کا مالک اپنی مافوق قوتوں سے سیاسی اور تمدنی چٹانوں میں ایسے درے پیدا کردے جن سے نفوذ کرکے ہم آگے جاسکتے ہوں۔ وہ ایسی موافق آندھیاں چلائے جس سے ایک طرف مخالف کیمپ کی طنابیں اکھڑیں اور دوسری طرف ملت اسلامیہ کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ وہ ایسی بارش برسائے جو ایک کے لئے کیچڑ اور دلدل بنے اور دوسرے کے لئے سیرابی اور تازگی کا سامان پیدا کرے۔ وہ ایسا زلزلہ برپا کرے جس سے بلندیاں پست ہوجائیں اور پستیاں ابھر کر اوپر آجائیں۔ وہ مقابلہ کے وقت ایک فریق کے اوپر رعب اور دوسرے فریق کے اوپر اَمَنَۃ نازل کرے۔ جب تک اس قسم کی غیرمعمولی آسمانی مدد ہمارا ساتھ نہ دے، محض سیاسی کارروائیاں یا جلسہ جلوس ہم کو کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے۔ دور اول کا اسلامی قافلہ بھی اسی قسم کی خداوندی نصرت سے کامیاب ہوا تھا اور آج بھی وہ کامیاب ہوگا تو اسی قسم کی نصرتوں سے کامیاب ہوگا

غلبہ کا ذریعہ دعوت الی اللہ

خدا کی اس برتر نصرت کا مستحق بننے کے لئے کسی مومن گروہ کو جس اہلیت کا ثبوت دینا ہے وہ ذاتی اصلاح کے بعد دعوت ہے۔ مومنین کے گروہ کے لئے خدا نے جس اجتماعی نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ تمام تر اس پر موقوف ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں صاحب ایمان ہو، اور پھر داعی الی اللہ ہونے کا ثبوت دے۔ موجودہ دنیا میں اہل ایمان کی اصل ذمہ داری شہادت علی الناس (حج) ہے۔ اہل ایمان دنیا کی قوموں کے اوپر خدا کی طرف سے حق کے گواہ ہیں (انتم شھداء اللہ فی الارض، حدیث) اس لئے بالکل فطری ہے کہ اسی اصل حیثیت کے تحقق پر ان کو خدا کا وہ عظیم انعام ملے جس کو غلبہ و سرفرازی کہا جاتا ہے۔

مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ایک گروہ دوسرے گروہ کو لوٹتا ہے، جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر غالب آنے کے لئے سرگرمیاں دکھاتا ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے دوسری

قوموں کی طرف سے بار بار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بار بار دوسرے گروہ کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے خلاف جذبات ابھرتے ہیں۔ وہ دوسری قوموں کی طرف سے اپنے کو خطرہ میں پاکر ان کے خلاف "جہاد" کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں دیکھئے تو اس کا جواب اس سے بالکل مختلف ملے گا جو ایک عام قومی لیڈر ایسے حالات میں سوچتا ہے۔ قرآنی جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ خواہ جان و مال کے نقصان کی سطح پر پیدا ہو مگر اس کا حل تمھارے لئے ابدی طور پر دعوتی عمل میں رکھ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ہر حال میں جدوجہد کا مقام دعوت الی اللہ ہے نہ کہ وہ دنیوی محاذ جہاں بظاہر ان کا حریف انھیں خطرہ بنا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں پیغمبر کے واسطہ سے امت کو یہی سبق دیا گیا ہے:

یا ایہا الرسول بلغ ما اُنزل الیک من ربک	اے رسول جو کچھ تم پر تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے
وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک	اسے پہنچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کا پیغام نہ پہنچایا
من الناس (مائدہ ۶۷)	اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی اہل ایمان کے لئے دوسروں کی طرف سے عدم تحفظ کا خطرہ ہو یا مغلوبیت کا سوال پیدا ہو تو ان کو دعوت الی اللہ کے کام کی طرف دوڑنا چاہئے۔ اسی کام میں لگنے سے خدا کا قانون ان کے حق میں متحرک ہوگا اور وہ غیر معمولی اسباب پیدا ہوں گے جو بالآخر ان کے لئے نجات اور کامیابی کا زینہ بن جائیں۔

دعوت دین کے کام کی ایک خاص فوقیت (Advantage) یہ ہے کہ فطرت کو ابدی طور پر اس کا ہم نوا بنا دیا گیا ہے۔ تعصب کی سطح پر کوئی آدمی خواہ کتنا ہی مخالف ہو مگر فطرت کی سطح پر حق کی آواز تمام انسانوں کے لئے اپنے دل کی آواز ہے۔ حق کی پکار ایک ایسی پکار ہے جس کا ایک مثنیٰ ہر آدمی کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ خدا کا دین اور انسان کی فطرت دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر اپنے خالق کا تصور لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کا باطن اس کی اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ہر لمحہ زور کر رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے ڈال دے۔ گویا دین حق ایک ایسا سودا ہے جس کا ہر آدمی پہلے سے خریدار بنا ہوا ہے۔

اس فطری مساعدت کے ساتھ اسلام کو ایک تاریخی مساعدت بھی حاصل ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے تمام مذاہب اپنے ماننے والوں کی تحریفات کے نتیجہ میں اپنا اصلی حسن کھو چکے ہیں۔ وہ اتنا بدل چکے ہیں کہ ان میں اور فطرت انسانی میں وہ مطابقت باقی نہیں رہی جو فی الواقع دونوں کے خالق نے دونوں کے درمیان رکھی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں جتنے لوگ کسی دوسرے مذہب کو مانتے ہیں وہ صرف روایت پرستی کی بنا پر اس کو مانتے

ہیں۔ وہ تعصب کی زمین پر کھڑے ہوئے ہیں نہ کہ فی الواقع فطری تصدیق کی زمین پر۔ کیونکہ فطری تصدیق وہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔ اگر ہم کسی طرح تعصب کا پردہ ہٹا دیں تو تمام دوسرے مذاہب بے زمین ہو جائیں گے اور لوگوں کو اس کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دے گا کہ وہ اسلام کے سایہ میں پناہ لیں۔

دعوتی تسخیر کی مثالیں

دعوت میں ہمارے لئے زندگی کا راز چھپا ہوا ہے، یہ کوئی قیاسی بات نہیں۔ اسلام کی تاریخ اس نظریہ کے حق میں واضح تائید پیش کرتی ہے۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز فرمایا۔ مگر مکہ کی زمین آپ کے لئے انتہائی سخت ثابت ہوئی۔ نبوت کے بارھویں سال بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی تاریخ مکہ سے شروع ہو کر مکہ ہی میں ختم ہو جائے گی۔ مگر اس کے بعد حیرت انگیز طور پر یثرب (مدینہ) میں یہ مواقع پیدا ہو گئے کہ آپ ہجرت کر کے وہاں جائیں اور وہاں اسلام کا مرکز قائم کریں۔ مدینہ میں یہ نیا امکان کیونکر پیدا ہوا۔ اس کا ایک ہی جواب ہے، اور وہ یہ کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ۔ مدینہ میں چند لوگوں کی دعوتی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں گھر گھر اسلام پھیل گیا (حتیٰ لم تبقَ دارٌ من دُور الانصار الا وفیہا رجال ونساء مسلمون، سیرۃ ابن ہشام جلد اول) اس طرح انتہائی مشکل اور مایوس کن حالات میں اسلام کی اشاعت کے ذریعہ مدینہ میں مسلمانوں کے لئے زندگی کے مواقع کھلے۔

۲۔ ہجرت نے اگرچہ مسلمانوں کے لئے اپنا ایک علاقہ مہیا کر دیا تھا۔ مگر مخالفین اسلام نے باقاعدہ جنگ چھیڑ کر دوبارہ اسلام کے لئے شدید حالات پیدا کر دئے۔ اسلام ایسی مشکلات میں گھر گیا کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ اسلام کے دشمن شاید اسلام کا وجود مٹا دیں گے۔ اس وقت پھر دعوت ہی تھی جس نے دوبارہ اسلام کے لئے نئے حالات کا دروازہ کھولا۔ حدیبیہ کی صلح کی صورت میں ہر ممکن قیمت دے کر جنگ و جدال کا ماحول ختم کر دیا گیا اور پُرامن حالات میں ازسرنو دعوتی عمل جاری کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال میں مسلمانوں کی تعداد چو گنے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ بالآخر قریش کے سردار اتنا مرعوب ہوئے کہ لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دئے۔

۳۔ فتح مکہ کے بعد پھر ایک بہت بڑا مسئلہ قبیلہ ثقیف کی صورت میں پیدا ہوا۔ وہ بے حد سرکش تھے اور دیواری شہر کے مالک ہونے کی وجہ سے ان پر فوجی کارروائی کرنا مسلمانوں کے لئے اپنے حالات کے لحاظ سے بظاہر ناممکن تھا۔ اس وقت قبیلہ ثقیف کو جس چیز نے زیر کیا وہ دعوت ہی تھی۔ قبیلہ ہوازن (۶ ہزار) کے ساتھ تالیف قلب کا طریقہ اختیار کر کے انھیں اسلام میں داخل کر لیا گیا۔ قبیلہ ہوازن طائف کے قبیلہ ثقیف کا

حلیف تھا۔ چنانچہ ان کے عمومی طور پر اسلام قبول کرتے ہی قبیلہ ثقیف کو محسوس ہوا کہ ان کا بازو ٹوٹ چکا ہے اور اب ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ مدینہ جاکر اسلام قبول کرلیں اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں ——— طائف کا دروازہ فوجی مہم کے لئے بند تھا، مگر دعوتی مہم کے لئے وہ کھلا ہوا نظر آیا۔

۴۔ اس کے بعد اسلامی تاریخ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آٹھویں صدی ہجری میں پہنچتی ہے۔ تاتاری قبائل ملکوں اور شہروں کو زیر وزبر کرتے ہوئے اسلامی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں اور بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تاراج کر کے رکھ دیتے ہیں۔ چنگیز خاں وسط ایشیا سے ۱۲۱۶ء میں ساٹھ ہزار وحشی انسانوں کو لے کر نکلا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر اور تیر اور تلوار لئے ہوئے آبادیوں پر ٹوٹ پڑے اور تمام تمدنی نشانات کو برباد کر ڈالا۔ عراق، ایران، ترکستان ان کے قدموں کے نیچے زیر وزبر ہو گئے جہاں اس وقت کی طاقت ور ترین سلطنت قائم تھی۔ سارے عالم اسلام پر دہشت کا سناٹا چھا گیا۔ ۱۲۵۳ء میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو کی سرکردگی میں یہ طوفان دوبارہ اٹھا اور ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی تہس نہس کر ڈالا جو عظیم مسلم خلافت کی بربادی کے بعد ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم عصر مورخ ابن اثیر (م ۶۳۸ھ) کے الفاظ میں "اگر کوئی شخص کہے کہ آدم سے لے کر اب تک ایسا کوئی حادثہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو اس کا کہنا غلط نہ ہوگا" ایک مغربی مورخ کے نزدیک یہ واقعہ اتنا ہولناک تھا کہ اس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے:

"آسمان نے زمین پر گر کر تمام چیزوں کو مٹا دیا"

Jenghiz Khan, by Harold Lamb, P. 266

اس نازک وقت میں اسلام کی دعوتی طاقت ہی تھی جس نے تاتاریوں کے نہ رکنے والے سیلاب سے اسلام کو بچایا۔ تاتاری اپنی مفتوح رعایا کے ذریعہ اسلام سے متعارف ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ اسلام نے انھیں جیت لیا اور ان کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام کے دشمن اسلام کے پاسبان بن گئے۔ یہ کام کن مسلمانوں کے ذریعہ انجام پایا۔ اس سلسلہ میں وقت کی قابل ذکر شخصیتوں کا نام تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ غالباً یہ واقعہ بھی اسی طرح ظہور میں آیا جس طرح موجودہ زمانہ میں قبول اسلام کے واقعات ظہور میں آرہے ہیں۔ آج مختلف ملکوں میں لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر ان نومسلموں تک اسلام کو پہنچانے کا کام اکابر کے ذریعہ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ دراصل کچھ غیر معروف اصاغر ہیں جو خاموشی کے ساتھ دعوت دین کا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آٹھویں صدی ہجری میں تاتاریوں میں تبلیغ اسلام کا کام بھی غالباً کچھ غیر مشہور مسلمانوں کے ذریعہ انجام پایا۔ تاتاریوں کے سلسلے میں اسلام کی دعوتی قوت کا اعتراف عام طور پر مورخین نے کیا ہے۔ یہاں ہم دو غیر مسلم محققین کے اقتباسات نقل کرتے ہیں:

Although in after years this great empire was split up and the political power of Islam diminished, still its spiritual conquests went on uninterruptedly. When the Mongols hordes sacked Baghdad (AD 1258) and drowned in blood the faded glory of the Abbasid dynasty, Islam had just gained a footing in the island of Sumatra and was just about to commence its triumphant progress through the island of the Malay Archipelago. In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century and in each case the conquerers have accepted the religion of the conquered.

T.W. Arnold, The Preaching of Islam (1896) P. 2

بعد کے سالوں میں اگرچہ یہ عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی قوت کم ہوگئی۔ مگر اس کی روحانی فتوحات بغیر وقفہ کے برابر جاری رہیں۔ مغل قبائل نے جب ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی شان وشوکت کو خون میں غرق کر دیا، اس وقت اسلام جزیرہ سماترا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنا فاتحانہ سفر شروع کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے مواقع پر کافر قبائل نے اپنے پاؤں محمد کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دیے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔

Hard pressed between the mounted archers of the wild Mongols in the Fast and the mailed knights of the Crusaders on the West, Islam in the early part of the 13th century seemed for ever lost. How different was the situation in the last part of the same century, The last crusader had by that time been driven into the sea. The seventh of the Īl-Khans, many of whom had been flirting with Christianity, had finally recognised Islam as the state religion - A Dazzling victory for the faith of Mohammad. Just as in the case of the Seljuqs, the religion of the Muslims had conquered where their arms had failed. Less than half a century after Hulagu's merciless attempt at the destruction of Islamic culture, his grcat-grandson Ghazan, as a devout Muslim, was consecrating much time and energy to the revivification of the same culture.

History of the Arabs, The Macmillan press Ltd., London, 1968, P.488

مشرق میں وحشی منگولوں کے تیر اندازوں کی یلغار اور مغرب میں زرہ پوش صلیبی سرداروں کے درمیان تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ مگر اسی صدی کے آخری حصہ میں صورت حال کتنی مختلف ہو چکی تھی۔ آخری صلیبی اس وقت سمندر میں دھکیلا جا چکا تھا۔ گیارہ تاتاری خانوں میں سے ساتویں خان نے، جن میں سے اکثر (کے یہاں عیسائی بیویاں تھیں اور) وہ عیسائیت کی طرف مائل تھے، بالآخر اسلام کو سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کر لیا۔ محمد کے مذہب کی یہ کیسی شاندار فتح تھی۔ بالکل سلجوقوں کے معاملہ کی طرح، مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔ ہلاکو کے ہاتھوں اسلامی تہذیب کی بے رحمانہ تباہی کے بعد نصف صدی سے بھی کم مدت میں اس کا پوتا غازان مسلمان ہو کر اسی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت اور قوت خرچ کر رہا تھا۔ (فلپ کے ہٹی)

ایک تاریخی سبق

تاتاریوں کا یہ قیامت خیز واقعہ امام تقی الدین ابن تیمیہ (۷۲۸ — ۶۶۱ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ اسلام کی عظمت کو مٹتا ہوا دیکھ کر انھیں جوش آیا۔ امام ابن تیمیہ مجاہدانہ جذبہ کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے شام ومصر کے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا کہ جنگ کا علاج جنگ ہے (الحرب انفی للحرب[۵]) وہ ۷۰۲ھ میں مصر کے سلطان الناصر کے ساتھ تاتاریوں سے جنگ کے لئے نکلے۔ ابتدائی طور پر انھیں تاتاریوں کے ایک دستہ کے مقابلہ میں کچھ فوجی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر بالآخر تاتاری غالب رہے اور امام ابن تیمیہ کچھ دن دمشق کے قلعہ میں اور کچھ دن تدریس وتصنیف میں زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے گئے۔

امام ابن تیمیہ تاتاریوں کے مسئلہ کو فوجی قوت سے ختم کرنا چاہتے تھے مگر وہ اس کو ختم نہ کر سکے۔ عین اس وقت اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہوئی اور اس نے تاتاریوں کے مسئلہ کو نہ صرف ختم کیا بلکہ ان کو اسی اسلام کا خادم بنا دیا جس کی جڑوں کو اکھاڑنے کے لئے وہ قسمیں کھا چکے تھے ــــــ آٹھویں صدی ہجری کا یہ تجربہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے سبق دے رہا تھا کہ اسلام کی حفاظت اور اس کی سربلندی کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اس عظیم تاریخی واقعہ سے کوئی سبق نہیں لیا۔ موجودہ زمانہ میں دور جدید کے "تاتاریوں" کی طرف سے اسلام کے لئے مسائل پیدا ہوئے تو دوبارہ مسلمانوں کی پوری قیادت حملہ آوروں کے خلاف سیاسی جہاد میں مصروف ہو گئی۔ اس پوری مدت میں کوئی قابل ذکر شخص نظر نہیں آتا جو دعوتی جہاد کو جہاد سمجھے اور اس کے لئے سرگرم ہو۔

اسلام جدید دور میں

نپولین نے ۱۷۹۸ء میں مصر وشام پر حملہ کیا۔ اس سے دو سو سال پہلے سولھویں صدی عیسوی میں پرتگالی تاجر ہندستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد دوسری مغربی قومیں آئیں۔ اس طرح پچھلی چند صدیوں میں پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ نے پوری مسلم دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اولاً برصغیر ہند کی مغل سلطنت اور اس کے بعد ترکی کی عظیم عثمانی خلافت ختم ہو گئی۔ موجودہ صدی میں اگرچہ سیاسی استعمار ختم ہو چکا ہے مگر تکنکی استعمار کی صورت میں مغرب اب بھی پوری طرح مسلم دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ دفاعی ہتھیاروں کی خریداری سے لے کر قرآن مقدس کی طباعت واشاعت تک تمام کاموں کے لئے مسلمان انھیں مغربی قوموں کے دست نگر ہیں۔

---

[۵] محمود مہدی الاستانبولی، ابن تیمیہ بطل الاصلاح الدینی، مکتبہ دار المعرفۃ، دمشق، ۱۳۹۷ھ، صفحہ ۳۶

مغربی تسلط کا مسئلہ پیدا ہوتے ہی پوری مسلم دنیا میں اس کے خلاف تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اب بھی بدستور جاری ہیں۔ پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کے درمیان جتنی بھی تحریکیں اٹھی ہیں سب کے پیچھے اصل قوت محرکہ یہی اجنبی تسلط کا مسئلہ نظر آتا ہے۔ یہ تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک ہے۔ سب کا طرز فکر بنیادی طور پر سیاسی ہے۔ ان سب کو ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مقصد اجنبی اقوام کے پیدا کردہ مسائل کا سیاسی حل تلاش کرنا تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً بلا استثنا صدفی صد ناکام رہیں۔ جان ومال کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان کا کوئی حقیقی حاصل مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا ——— مسلمانوں کے عالمی سیاسی اتحاد کے لئے اتحاد اسلامی (پان اسلام ازم) کی تحریک چلائی گئی۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ عثمانی خلافت اور مغل سلطنت دونوں ٹوٹ گئیں اور ان کے زیر حکومت علاقے درجنوں الگ الگ مسلم خطے میں بٹ گئے۔ مسلمانوں نے مغرب کے سیاسی استعمار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بے شمار جانیں قربان کیں اور بے حساب مال لٹا دیا مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ سیاسی استعمار ختم ہو کر سائنسی اور تکنکی استعمار ان کے اوپر مسلط ہوگیا۔ مسلمانوں نے اجنبی محکومی سے نجات پانے کے لئے اپنی ساری طاقت لگادی مگر جب اجنبی محکومی ختم ہوئی تو خود اپنے ملک کے ملحدوں اور باغیوں کی محکومی ان کے اوپر قائم ہوچکی تھی۔ مسلمانوں نے ایک اسلامستان بنانے کے لئے تاریخ کی سب سے بڑی قربانی دی۔ مگر جب وہ بنا تو صرف یہ ہوا کہ ایک واحد ملک کے مسلمان کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہوگئے ——— فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے سوال پر ساری مسلم دنیا ایک ہوگئی اور اس کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا۔ مگر اسرائیل کا حال یہ ہے کہ اس کی طاقت اور رقبہ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جس جس میدان میں بھی کوشش کی ہے ہر میدان میں انھوں نے صرف کھویا ہے، انھوں نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ بائبل کے نبی حجیؑ کے الفاظ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے"، مگر اس عمومی محرومی کی فضا میں حیرت انگیز طور پر ایک ایسا میدان موجود ہے جہاں اسلام اپنے آپ پیش قدمی کر رہا ہے۔ جب کہ بقیہ میدانوں میں بے شمار کوششیں اور قربانیاں بھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام ہیں، یہاں کسی قابل ذکر کوشش کے بغیر اپنے آپ مفید نتیجہ ظاہر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہ میدان اسلام کی اشاعت کا میدان ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو غیر مسلموں تک پہنچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ تقریباً ساری دنیا میں اسلام اپنے آپ غیر مسلم

قوموں میں پھیلتا جارہا ہے ۔ ہندستان میں ہریجن عمومی پیمانہ پر اسلام قبول کر رہے ہیں ۔ جاپان میں سنجیدہ طبقہ بہت تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے ۔ امریکہ میں کالی نسل کے لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں ۔ افریقہ کے پس ماندہ قبائل ہر دن ہزاروں کی تعداد میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں، وغیرہ۔ اسلام کی یہ لہر صرف نچلے طبقات تک محدود نہیں ہے ۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچی حیثیت کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا ہے، اور یہ سب کچھ مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر اپنے آپ ہو رہا ہے ۔

مواقع انتظار کرتے رہے

۱۹ویں صدی کے نصف ثانی اور ۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں جب کہ مسلم قائدین انتہائی بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان سے اپنا سر ٹکرا رہے تھے، متعدد ایسے نمایاں واقعات ظہور میں آئے جو کھلا ہوا اشارہ دے رہے تھے کہ کرنے کا کام دعوت و تبلیغ ہے نہ کہ حکمرانوں سے سیاسی تصادم ۔ نمونہ کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

کان میکادو الیابان قد ارسل فی زمن وجود السید بالاستانہ (۱۸۹۱) کتابا الی السلطان عبد الحمید یخطب فیہ مودتہ ویقول : ان کلا منا ملک شرقی ، ومن مصلحتنا ومصلحۃ شعوبنا ان نتعارف ونتزاور وتکون الصلات بیننا قویۃ تجاہ الدول والشعوب الغربیۃ التی تنظر الینا بعین واحدۃ ۔ انّنی اری شعوب الافرنج یرسلون الی بلادنا دعاۃ الی دینھم لحریۃ الدین عندنا ولا اراکم تفعلون ذلک ، فانا احب ان ترسلوا الینا دعاۃ یدعون الی دینکم (الاسلام) ویمکن ان یکون ھولاء صلۃ معنویۃ بیننا وبینکم (صفحہ ۳۴)

محمود ابوریہ ، جمال الدین افغانی ، لجنۃ التعریف بالاسلام ، القاہرہ ، ۱۳۸۶ھ

۱۸۹۱ میں جب کہ سید جمال الدین افغانی آستانہ (ترکی) میں تھے ، جاپان کے شہنشاہ میجی (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) نے سلطان عبد الحمید ثانی کے پاس ایک خط بھیجا ۔ اس خط میں اس نے دوستی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ہم دونوں مشرقی بادشاہ ہیں ۔ ہماری مصلحت اور ہماری قوم کی مصلحت یہ ہے کہ ہم باہم متعارف ہوں اور ملیں جلیں ۔ اور ہمارے درمیان مضبوط رشتہ ہو تاکہ ہم مغربی قوموں اور سلطنتوں کا مقابلہ کر سکیں جو ہم سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں ۔ میں دیکھتا ہوں کہ مغربی قومیں ہمارے ملک میں اپنے دینی مبلغ بھیج رہی ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں مذہبی آزادی ہے ۔ مگر میں نہیں دیکھتا کہ آپ بھی ایسا کرتے ہوں ۔ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ آپ بھی جاپان میں ایسے لوگ بھیجیں جو یہاں آپ کے دین اسلام کی تبلیغ کریں ۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہمارے اور آپ کے درمیان مضبوط معنوی رشتہ قائم ہو جائے ۔

شہنشاہ جاپان کا یہ خط جب ترکی کے دار السلطنت پہنچا، اس وقت سید جمال الدین افغانی اور دوسرے بڑے بڑے علماء اور اکابر وہاں موجود تھے ۔ سلطان عبد الحمید ثانی نے ان لوگوں کو جمع کر کے شہنشاہ جاپان کا

خط دکھایا مگر کسی نے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ جاپان کا سرکاری قاصد رسمی شکریہ کا جواب لے کر واپس چلا گیا۔

قریبی ماضی میں اس طرح کے عظیم مواقع کو استعمال نہ کرنے کی وجہ صرف ایک تھی، دعوتی کام کی اہمیت سے مسلمانوں کا غافل ہونا۔ لوگ بطور خود جن سیاسی یا غیر سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے بس اسی کو وہ کام سمجھتے رہے۔ اور غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کے کام کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ غیر مسلموں کا قافلہ خود ان کے یہاں آکر ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

خدائی فیصلہ

انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک فرد لارڈ ہیڈلے فاروق نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں گابون (افریقہ) کے صدر مملکت محمد عمر بانگو نے اسلام کو اپنا دین بنانے کا اعلان کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی طرح غیر مسلم اقوام کے لاکھوں لوگ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ان میں نہ صرف عوام ہیں بلکہ تاجر، ڈاکٹر، انجینئر، اہل علم اور سرکاری عہدہ دار جیسے لوگ بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی انتہائی نادان سیاست کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمان سخت مغلوبیت کی حالت میں پہنچ گئے تھے، اچانک اسلام کی دعوتی قوت نے اپنا کرشمہ دکھایا اور یہاں کے پس ماندہ طبقات نے عمومی پیمانہ پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ یہ واقعہ کتنا عظیم ہے۔ اس کا اندازہ ایک اقتباس سے ہوگا۔ مسٹر کرشنا دھن سردار (رامیشور پور، مغربی بنگال) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہندو دوسرے جنم میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور ہندوازم کا نیا جنم عمومی طور پر اسلام قبول کرنے کی صورت میں فروری کے وسط میں تامل ناڈو میں شروع ہوگیا ہے:

> Hindus believe in re-birth and the re-birth of Hinduism has taken place in Meenakshipuram (Tamil Nadu) in the middle of February (1981) in the form of mass conversion to Islam.
>
> Radiance Weekly, August 9, 1981

اس قسم کے واقعات جو دنیا بھر میں ہو رہے ہیں وہ مسلمانوں کی تمام موجودہ تحریکوں کو خدا کی نظر میں بے اعتبار (Discredit) ٹھہرانے کے ہم معنی ہیں۔ مسلمان جن میدانوں میں جان و مال کی قربانی دے کر اپنا مستقبل تلاش کرتے رہے وہاں سے کسی بھی درجہ میں مطلوبہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ان میدانوں میں ان کی کوششیں حبطِ اعمال کا مصداق بنتی رہیں۔ دوسری طرف وہ میدان جہاں جدید مسلم قیادت نے دنیا بھر میں کہیں سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی تھی وہاں اپنے آپ لہلہاتی ہوئی فصل نکلی چلی آرہی ہے۔ اس طرح خدا بتا رہا ہے کہ تم جن مقامات پر میری مدد تلاش کر رہے ہو وہاں مجھے مدد دینا مطلوب ہی نہیں ہے۔ یہ زمین

وہ زمین ہی نہیں جہاں میرے انعامات کی فصل اگتی ہو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میری وہ مدد تمھیں حاصل ہو جس سے بند دروازے کھلتے ہیں اور چٹانیں اپنی جگہ سے کھسکنے لگتی ہیں تو تم دعوت کی زمین میں اپنی کوششیں صرف کرو جس کو میں نے اتنا زرخیز بنایا ہے کہ کسی عمل کے بغیر ہی اس کے اندر سے شاندار فصل نکلی چلی آرہی ہے۔

خدا ہم کو دعوت و تبلیغ کے میدان میں سرگرم ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر مسلمان قدرت کے اس اشارہ کو سمجھیں اور اپنی کوششوں کو غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کے کام میں لگا دیں تو موجودہ نتائج کی رفتار کئی گنا بڑھ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ موجودہ نسل ہی میں غلبۂ اسلام کا وہ خواب پورا ہو جائے جس کی تعبیر ہم صدیوں سے دوسرے میدانوں میں تلاش کر رہے ہیں مگر وہ کسی طرح پورا نہیں ہوتا۔

عبرتناک منظر

مغرب کے مشہور مفکر جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰ – ۱۸۵۶) نے کہا تھا کہ اگر کوئی مذہب ہے جو اگلے سو سال میں انگلستان پر حکومت کرے، نہیں بلکہ سارے یورپ پر حکومت کرے تو وہ صرف اسلام ہوگا۔ میں نے محمد کے مذہب کو ہمیشہ بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر حیرت انگیز طاقت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کو اپنے اندر جذب کر سکے، جس کے اندر ہر دور کے لئے اپیل ہے:

> If any religion has the chance of ruling over England, nay Europe, within the next hundred years, it can only be Islam. I have always held the religion of Muhammad in high estimation because of its wonderful vitality. It is the only religion which appears to me to possess the assimilating capability to the changing face of existance, which can make its apeal to every age.

ہندستان کے مشہور ہندو مفکر سوامی ویویکانند (۱۹۰۲ – ۱۸۶۳) نے لکھا تھا کہ ادویتا واد مذہب اور فکر کی دنیا میں آخری لفظ ہے اور واحد پوزیشن ہے جہاں سے ایک شخص تمام مذاہب اور فرقوں کو محبت کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ تاہم عملی ادویتا واد جو تمام انسانیت کو خود اپنی طرح دیکھتی ہے اور اپنوں کا سا سلوک کرتی ہے، کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہو سکی۔ دوسری طرف میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب قابل لحاظ حد تک اس مساوات کو پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسی لئے میں قطعی طور پر یہ خیال رکھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر ویدانت کے نظریات بالکل ہی بے قیمت ہیں۔ ہمارے مادر وطن (ہندستان) کے لئے جو دو عظیم نظامات، ہندو ازم اور اسلام کا مقام اتحاد ہے، ویدانت کا دماغ اور اسلام کا جسم ہی واحد امید ہے۔ میں اپنے تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان موجودہ انتشار اور اختلاف سے نکل کر شاندار اور غیر مفتوح بن رہا ہے، اور یہ ویدانت کے دماغ اور

اسلام کے جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے :

I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strive, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body.

Letters of Swami Vivikanand (1970) P.453

کیسی عجیب بات ہے۔ جدید انسان کو جہاں اپنی زندگی کی کہانی اسلام کے بغیر نامکمل دکھائی دیتی ہے، وہاں ہمیں کرنے کا کوئی کام نظر نہیں آتا۔ اور جہاں جدید انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے بغیر اس کی کہانی آخری حد تک مکمل ہے، وہاں ہم اس کی پتھریلی دیوار سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ عبرتناک منظر شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی واحد امید ہے، دنیا کی بھی اور خود مسلمانوں کی بھی۔ دنیا، اپنی تمام ترقیوں کے باوجود، اس لئے بے چین ہے کہ اس کو مالک کائنات کی سچی رہنمائی حاصل نہیں۔ مسلمان اس لئے برباد ہیں کہ ان کے ذمہ خدا کی سچائی کو دوسروں تک پہنچانے کا کام سپرد کیا گیا تھا اور اس کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ بقیہ دنیا حق سے محرومی کی سزا بھگت رہی ہے اور مسلمان حق سے غفلت کی۔ یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمان حق کے داعی بن کر کھڑے نہ ہوں۔ دوسرے کاموں میں مشغول ہونا یا دوسرے کاموں کو دعوت و تبلیغ کا نام دینا صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتا ہے، نہ کہ وہ انھیں خدا کی رحمتوں کا مستحق بنائے ــــ مسلمان اگر دعوت الی اللہ کا کام کریں تو ان کے لئے اس دنیا میں سب کچھ ہے۔ اور اگر وہ اس مطلوبہ کام کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کی اس دنیا میں ان کے لئے کچھ نہیں۔

آسٹریلیا کی ایک مسیحی خاتون نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے :

This is the passing glimpse of Islam. And it has much to offer to our restless world. But it seems to be an abandoned treasure, abandoned by those who bear its name. No wonder their lives are so different from the glory I described. And unless they return back to it again, they will remain in bewilderment in the re^r of humanity's procession. For it is remedy, light and guidance from God, for them and for the world. (P.44)

Dr Cheris Wady, The Muslim Mind, Macmillan Co. Ltd. Bombay

یہ اسلام کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ اور اس میں ہماری بے چین دنیا کے لئے بہت کچھ ہے۔ مگر یہ بظاہر ایک چھوڑا ہوا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کو ان لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے جو اس کا نام لیتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ ان کی زندگیاں اس عظمت سے بہت مختلف ہیں جو میں نے بیان کیا۔ اور جب تک وہ دوبارہ اس اسلام کی طرف واپس نہ ہوں وہ حیران و پریشان انسانیت کے قافلہ سے بچھڑے ہی رہیں گے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے یہی ایک علاج اور روشنی اور رہنمائی ہے ان کے لئے بھی اور ساری دنیا کے لئے بھی۔

اوپر ہم نے قرآن کے اس ارشاد کا تاریخی مطالعہ کیا ہے کہ عصمت من الناس کا راز تبلیغ ما انزل اللہ میں ہے (مائدہ ۶۷) یہ بات جب پہلی بار پیغمبر کی زبان پر جاری کی گئی تو وہ واقعات سامنے نہیں آئے تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ یہ تاریخ ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں ان الفاظ پر یقین لانا اور اس کی راہ میں اپنے جان و مال کو وقف کرنا بلاشبہ مشکل ترین کام تھا۔ تاریخ کو اس کے اختتام پر دیکھنا جتنا آسان ہے، تاریخ کو اس کے آغاز پر دیکھنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے تاریخ کے مشکل ترین کام کو انجام دیا۔ انھوں نے واقعہ کے ظہور میں آنے سے پہلے واقعہ کو دیکھا اور اس کی خاطر مطلوبہ عمل کیا۔ اس کے مقابلہ میں ہمارے حصہ میں تاریخ کا آسان ترین کام آیا تھا۔ ایک اصول کے تاریخی واقعہ بن جانے کے بعد ہمیں اپنی زندگیوں میں اسے دہرانا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے پیش رو تو مشکل ترین امتحان میں پورے اترے اور ہم آسان ترین امتحان میں بھی ناکام ہو گئے۔

بے شک اللہ انکار کرنے والوں کو راستہ نہیں دکھاتا (مائدہ ۶۷) اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ مسلمان اگر خدا کے بتائے ہوئے اصول پر دعوت الی اللہ کا کام کریں تو خدا ان کے مخالفین کو ایسا اندھا کر دے گا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی مؤثر منصوبہ بندی نہ کر سکیں اور ان کو برباد کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں۔ تاہم دوسرے پہلو کے اعتبار سے اس کا تعلق خود داعی سے بھی ہے، اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مسئلہ کی وضاحت کے بعد اگر مسلمان اس کو نہ مانیں اور اس طریقہ کو چھوڑ کر وہ اپنے تحفظ اور احیار کے لئے دوسرے راستوں میں محنت کریں تو خدا ان کی محنتوں کو بارآور ہونے نہ دے گا۔ وہ ان کو کامیابی کے رخ پر نہیں چلائے گا۔ ان کی بڑی بڑی کوششیں بھی عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج مسلمانوں کی کوششوں کے ساتھ یہی کچھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے احیار کے لئے جان و مال کی بے حساب قربانیاں دیں مگر ان کی تمام قربانیاں بالکل لاحاصل ہو کر رہ گئیں۔ حضرت مسیح سے پہلے نبی حجّی نے جو کچھ یہود کے بارے میں کہا تھا وہ آج پوری طرح مسلمانوں کے اوپر چسپاں ہو رہا ہے ــــ تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا تم کھاتے ہو پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو پر پیاس نہیں بجھتی۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور تم کو تھوڑا ملا اور جب تم اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر خدا نے ان کے "کھلیان" کو ہوا میں اڑا دیا۔ یہ خدائی تنبیہ اگر مسلمانوں کے لئے کافی نہیں تو اس کے بعد ان کی بیداری کے لئے صور اسرافیل کا انتظار کرنا چاہیے۔

ضابطۂ فطرت

خدا نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں ان کی کارکردگی کا اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔ ہر چیز ٹھیک اسی پیمانہ کے مطابق اپنا عمل کرتی ہے (الفرقان ۲) سورج، چاند اور ستاروں کی گردش کے نہایت محکم ضابطے ہیں اور ایک لمحہ کے فرق کے بغیر وہ ٹھیک اسی کے مطابق اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں (یٰس ۳۹) ایک عورت کے پیٹ میں بچہ کی پرورش کا آغاز ہوتا ہے، وہ اس کے اندر دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور بالآخر ایک مکمل انسان کی صورت میں تیار ہو کر ایک متعین وقت پر باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے لئے خدا کے یہاں ایک مقدار مقرر ہے (کل شیٔ عندہ بمقدار، الرعد ۸) اسی ضابطہ بندی کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر چیز کا سفر اس طرح جاری رہے کہ دوسرے سے ٹکرائے بغیر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے

(لا الشمس ینبغی لہا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار کل فی فلک یسبحون، یٰس ۴۰)

یہ اصول صرف ان چیزوں کے متعلق نہیں ہے جہاں خدا کے براہ راست حکم کے تحت کوئی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی اصول ان انسانی معاملات میں بھی ہے جہاں انسان کی اپنی کوششوں سے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔

انسانی واقعات کے لئے مقرر ضابطہ

قدیم عربوں میں یہ رواج تھا کہ جب بھی کسی کو اپنی بیوی پر غصہ آیا، فوراً اس نے تین طلاق بلکہ سو طلاق دے دی اور اس کے بعد ہی عورت کو گھر سے نکال دیا۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار ذاتی، خاندانی اور سماجی مسائل پیدا ہوتے تھے۔ قرآن میں یہ اصول مقرر کیا گیا کہ جس کو طلاق دینا ہو وہ عدت کے حساب سے طلاق دے اور اس عدت کا اہتمام کے ساتھ شمار کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو طہروں کے اندر دو مہینوں میں ایک ایک بار طلاق دے۔ پھر تیسرے مہینہ کے تیسرے طہر میں اگر چاہے تو رجوع کرلے اور چاہے تو دستور کے مطابق طلاق کو مکمل کر کے عورت کو رخصت کر دے۔ اس طرح ایک ناخوش گوار واقعہ، کوئی مزید خرابی پیدا کئے بغیر، اپنی فطری ترتیب سے آخری نوبت کو پہنچ جاتا ہے۔ نیز اس غیر عاجلانہ طریقہ کا یہ فائدہ بھی ہے کہ عورت اگر حاملہ ہے تو اس دوران میں اس کا حمل معلوم ہو جائے گا اور اس کی عدت وضع حمل تک مقرر کی جا سکے گی تاکہ جو شخص اس کے حمل کا سبب بنا ہے اس کے خرچ پر وہ اس کے گھر رہ کر وضع حمل کی مدت پوری کر سکے۔

جلد بازی کے بجائے اس طرح صبر اور انتظار کے اصول پر عمل کرنے کے بہت سے فائدے ہیں۔ اس دوران میں ہر دو فریق کے لئے ایسے نئے امکانات کھل جاتے ہیں جن کا ابتدائی وقت میں اندازہ نہیں کیا

جاسکتا تھا۔ اس طرح ایک خاندانی واقعہ اپنی فطری رفتار سے اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے کوئی غیر ضروری قسم کی پیچیدگی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ عمل کا یہ انداز قرآن کے الفاظ میں بالغ الامر انداز ہے:

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شئ قدرا (الطلاق ۳)

اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ اللہ اپنے امر کو پورا کرکے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔

یعنی جو شخص خدا کے مقرر کئے ہوئے طریقہ کو صحیح ترین طریقہ سمجھ کر اس پر اعتماد کرے گا اور صبر و انتظار کی تلخیوں کے باوجود اس کی پیروی میں اپنے معاملات انجام دے گا تو اس کی یہ روش اس کے معاملات کے حسن تکمیل کی ضمانت بن جائے گی۔ خدا تمام چیزوں سے آخری حد تک باخبر ہے اور اس نے انسان کے لئے کارکردگی کا جو ضابطہ طے کیا ہے اس میں تمام پہلوؤں کی کامل رعایت شامل ہے۔ اس نے اپنے علم کلی کے تحت ہر چیز کے عملدرآمد کا ایک انتہائی درست نظام مقرر کر دیا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو اس مقررہ نظام کی کامل پابندی کرے۔

خاموش تدبیر

قرآن میں کائناتی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اللہ ہر کام کا انتظام کر رہا ہے اور وہ نشانیوں کو کھول کر بیان کرتا ہے (یدبر الامر یفصل الآیات، الرعد ۲) یعنی قرآن اور کائنات دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ قرآن میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ وہی ہیں جن پر خدا نے کائنات کو بالفعل قائم کر رکھا ہے۔ کائنات قرآن کی عملی تصدیق ہے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن جس ربانی حقیقت کا لفظی بیان ہے، بقیہ کائنات اسی کا عملی مظاہرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق مضبوط بنیادوں پر اپنی تعمیر کریں۔ وہ اپنے وقت، اپنے مال اور اپنے طاقت ور کردار سے خدا کے دین کی عمارت کو اتنا مستحکم کر دیں کہ خدا کے دشمن اس کو ہلا نہ سکیں۔ خدا اپنے دین کو زمین پر غالب و سربلند دیکھنا چاہتا ہے اور یہ کام اہل ایمان کی جدوجہد اور قربانیوں ہی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے۔ قرآن میں ایک مثال مکڑی کے گھر کی دی گئی ہے (وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت، عنکبوت) دوسری مثال لوہے کی ہے (وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید، الحدید) بیت العنکبوت معمولی جھٹکے کو بھی سہار نہیں سکتا۔ مگر بیت الحدید کے مقابلہ میں بڑے بڑے طوفان بھی بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح خدا نے دو عملی مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ تم اپنے دین کا گھر مکڑی کے گھر کی طرح نہ بناؤ بلکہ لوہے کے گھر کی طرح بناؤ۔

مضبوط اور یقینی تعمیر کے لئے خدا کا جو طریقہ ہے اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ خاموش تدبیر کے ذریعہ دشمن کو بے زور کر دیا جائے اور اس کی جگہ حق کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس اصول کی وضاحت کے لئے یہاں دو آیتیں نقل کی جاتی ہیں :

قد مکر الذین من قبلھم فاتی اللہ بنیانھم من القواعد فخر علیھم السقف من فوقھم و اتاھم العذاب من حیث لا یشعرون (النحل ۱۶)

ان سے پہلے والوں نے تدبیریں کیں۔ پھر اللہ ان کی عمارت پر بنیادوں سے آگیا۔ پھر ان کی چھت اوپر سے ان پر گر پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آیا جہاں سے ان کو خیال بھی نہ تھا

ھو الذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتاب من دیارھم لاول الحشر ما ظننتم ان یخرجوا و ظنوا انھم مانعتھم حصونھم من اللہ فاتاھم اللہ من حیث لم یحتسبوا و قذف فی قلوبھم الرعب یخربون بیوتھم بایدیھم و ایدی المومنین فاعتبروا یا اولی الابصار (الحشر ۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے منکروں کو ان کے گھروں سے نکال دیا اول حشر پر۔ تمہارا گمان نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور وہ خیال کرتے تھے کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچانے والے ثابت ہوں گے۔ پھر اللہ ان پر وہاں سے آگیا جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔ اے آنکھ والو عبرت پکڑو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ دشمن کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ یہ عمل اپنی تکمیل تک اس طرح جاری رہے کہ دشمن کو خبر نہ ہو اور اچانک ایک روز اس کی پوری چھت اس کے سامنے گر پڑے۔

خدائی طریق کار کے بارے میں قرآن میں کچھ مثالیں دی گئی ہیں۔ تاہم یہ علامتی مثالیں ہیں۔ وہ اس لئے ہیں تاکہ ہم خدائی حکمت کو سمجھ جائیں اور دنیا میں اس طرح زندگی گزاریں کہ چاروں طرف بکھری ہوئی نشانیوں سے سبق لیتے رہیں۔

مثال کے طور پر دیمک کو دیکھئے۔ دیمک انسان کا ایک دشمن کیڑا ہے۔ دیمک چیونٹی کی طرح چھوٹا ہونے کے علاوہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ کھلی ہوا یا دھوپ میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مٹی کی نالی بنا کر چلتا ہے۔ اس کمزوری کے باوجود دیمک ہمیشہ انسان کو نقصان پہنچانے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ دیمک اتنی خاموشی کے ساتھ اپنا عمل کرتا ہے کہ انسان کو صرف اس وقت اس کی خبر ہوتی ہے جبکہ وہ اپنا کام کر چکا ہو۔ آپ کے کمرہ کا دروازہ اگر لکڑی کا ہے تو اس کے بازوؤں میں نہایت خاموشی کے ساتھ دیمک داخل

ہو جائے گی۔ وہ اندر ہی اندر لکڑی کو کھانا شروع کرے گی۔ بازوؤں کے اوپر آپ نے جو خوبصورت پالش کرا رکھی ہے اس کو کاغذ کی طرح چھوڑ دے گی۔ مزید یہ کہ وہ لکڑی کا جتنا حصہ کھائے گی اتنا ہی اس کے اندر مٹی بھرتی چلی جائے گی۔ اس طرح دیمک پوری لکڑی کھا ڈالے گی اور آپ کو اس کی خبر نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ وہ لکڑی کی اوپری پرت کو چھوڑ کر صرف اس کا اندرونی حصہ کھا رہی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ کھائے ہوئے حصہ میں مٹی بھرتی جاتی ہے جس کی وجہ سے لکڑی پولی نہیں ہوتی اور بدستور کھڑی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ دیمک جب پورے بازو کو کھا جاتی ہے تو ایک روز آپ کا دروازہ بے جان ہو کر گر پڑتا ہے۔

دوسری طرف اسی دنیا میں ایک اور مثال ہے۔ یہ کتے کی مثال ہے۔ کتا بھی انسان کو کاٹنا چاہتا ہے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو کاٹ پائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا آدمی کو دیکھ کر دور ہی سے بھونکنا شروع کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی چوکنا ہو کر اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیتا ہے ——— دیمک اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور کتا اپنے مقصد میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ کتے کے حصہ میں صرف بھونکنا آتا ہے اور دیمک کے حصہ میں اپنے منصوبہ کو آخری حد تک مکمل کرنا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دیمک خاموش تدبیر کے ذریعہ اپنا کام کرتا ہے۔ اور کتا شور وغل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح خدا دو زندہ نمونوں کے ذریعہ دکھا رہا ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کا طریقہ کیا ہے اور ناکامی کا طریقہ کیا۔

غیر عاجلانہ طریقہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بے صبر اور جلد باز واقع ہوا ہے (بنی اسرائیل ۱۱) بلکہ جلد بازی ہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے (انبیاء ۳۷) صحیح طریقہ یہ بتایا گیا کہ اولوالعزمی کے ساتھ صبر وانتظار کا طریقہ اختیار کیا جائے، جلد نتیجہ دیکھنے کی خواہش نہ کی جائے (الاحقاف ۳۵) جلد بازی یہ ہے کہ کسی حاصل کو پانے کے لئے جو ابتدائی شرائط ضروری ہیں ان کی تکمیل کے بغیر قبل از وقت اس کو پانے کی کوشش کرنا۔ مثلاً چنار کا درخت اگر قدرتی طور پر سو سال میں مکمل ہوتا ہے تو آدمی یہ چاہے کہ وہ صرف چند سال میں مکمل درخت بن کر اس کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اس قسم کی جلد بازی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ضرور ملا ہوا ہے کہ وہ جلد بازی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے وقت اور قوت کو ضائع کرتا رہے مگر خدا کے یہاں کسی واقعہ کے ظہور کے لئے جو فطری مدت مقرر ہے اس کو بدلنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔

یہ ضابطہ اتنا محکم ہے کہ اس میں پیغمبر تک کا کوئی استثناء نہیں، کسی واقعہ کے ظہور کے لئے وقت کی جو حد ہے اور کسی مقصود تک پہنچنے کے لئے جو طریقہ مقرر ہے، اس کی خلاف ورزی لازمی طور پر نقصان کا سبب بنے گی، خواہ یہ خلاف ورزی پیغمبر کی طرف سے ہوئی ہو۔

اس سلسلے میں ایک واضح مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ جب صحرائے سینا میں پہنچے تو خدا نے ان کے لئے ایک ماہ کی مدت مقرر کی اور فرمایا کہ تم طور پہاڑ پر آکر ۳۰ دن ذکر اور عبادت میں گذارو۔ اس کے بعد ذی الحجہ کی دس تاریخ کو تمھیں شریعت دی جائے گی۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰ کو ۱۰ ذی قعدہ کو طور پر پہنچنا چاہئے تھا۔ مگر وہ دس دن پہلے یکم ذی قعدہ کو طور پہ پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے موسیٰ، تم اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی کیوں چلے آئے۔ موسیٰ نے کہا کہ وہ لوگ میرے پیچھے ہیں اور میں جلدی اس لئے آگیا تاکہ تو مجھ سے راضی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے اس کو بہکا دیا (طٰہٰ ۸۵ — ۸۳)

حضرت موسیٰ کو جلد طور پر پہنچنے کا شوق ہوا۔ وہ بنی اسرائیل کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے بھائی ہارون کے سپرد کرکے وقت سے دس دن پہلے پہاڑ پر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ کا یہ فعل تمام تر رضائے الٰہی کے جذبہ سے تھا۔ مگر وہ قوم کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ قوم کی قیادت ابھی تک حضرت موسیٰ کر رہے تھے، اس کے اجتماعی نظم پر حضرت ہارون کی گرفت ابھی مضبوط نہیں ہوئی تھی کہ حضرت موسیٰ قبل از وقت اس سے علیحدہ ہوکر پہاڑ پر چلے گئے۔ چنانچہ قوم کے مفسدین نے ابھر کر غلبہ پالیا اور قوم کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا کر دیا۔ یہ عجلت اگرچہ نبی کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی اور خالص اللہ کی خوشنودی کے لئے تھی۔ مگر نہ تو اللہ نے ایسا کیا کہ وہ مقررہ تاریخ سے پہلے حضرت موسیٰ کو توراۃ کی تختیاں حوالے کر دے اور نہ ایسا ہوا کہ اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر وہ نتیجہ نہ نکلے جو ازروئے حقیقت نکلنا مقدر تھا۔

تدریجی اصلاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان کے لئے صلاح و فلاح کا جو نظام لے کر آئے تھے اس میں شراب کی حرمت بھی مطلوب کے درجہ میں شامل تھی۔ مگر آپ نے اپنی نبوت کے تقریباً نصف عرصہ تک اس معاملہ کا کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔ عملاً لوگوں کو ان کے حال پر رہنے دیا، صرف توحید اور آخرت کی باتوں سے لوگوں کے دلوں کو نرم کرتے رہے۔

شراب کے متعلق پہلا حکم آیا تو اس میں صرف ناپسندیدگی کا اظہار کرکے چھوڑ دیا گیا تاکہ ذہنوں کو اس کی حرمت قبول کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا: لوگ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان چیزوں میں بڑی خرابی ہے اور ان میں لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں (البقرہ ۲۱۹) اگرچہ اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں شراب کا حکم جاننے کے لئے سوال پیدا ہونے لگا تھا، اس کے باوجود اس کی بابت واضح حکم لوگوں کو نہیں بتایا گیا۔

اس کے بعد سنہ ھ میں شراب کے متعلق دوسرا حکم آیا۔ مگر اب بھی اس کی مکمل ممانعت نہیں کی گئی۔ ایک ایسی

بات کہی گئی جس سے شراب کا ناپاک ہونا واضح ہوتا تھا اور شراب نوشی کے اوقات پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ یعنی یہ کہ نشہ کی حالت میں خدا کی عبادت کرنے کی ممانعت ۔ حکم ہوا کہ اے ایمان والو، جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم نماز میں کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو (النساء ۴۳)

مذکورہ حکم کے کچھ مدت بعد شراب کی مکمل حرمت نازل ہوئی ۔ قرآن میں ارشاد ہوا : اے ایمان والو، شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں ۔ ان سے پرہیز کرو ۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے ۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ وہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے ۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے (المائدہ ۹۱ ۔ ۹۰) اب لوگوں کے ذہن تیار ہو چکے تھے ۔ چنانچہ یہ آیت آتے ہی لوگ کہہ اٹھے : انتھینا ربنا انتھینا ربنا (اے ہمارے رب ہم باز آئے، اے ہمارے رب ہم باز آئے) اور شراب کے ذخیروں کو زمین پر بہا دیا۔

شراب کی حرمت کے متعلق جو حکمتِ تدریج اختیار کی گئی اس کے بارے میں حضرت عائشہ رضی کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے :

انما نزل اول ما نزل سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام ۔ ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا (بخاری باب تالیف القرآن)	قرآن میں سب سے پہلے مفصل سورتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے ۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام کے لئے ہموار ہو گئے تو حرام و حلال کی آیتیں اتریں۔ اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے ۔ اور اگر پہلے ہی اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے ۔

استحکام کے بعد اقدام

عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ حرم کو ہر قسم کی مشرکانہ آلائشوں سے پاک کر کے اس کو دوبارہ خالص توحید کا مرکز بنا دیں، جیسا کہ وہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے زمانہ میں تھا۔ آپ کی بعثت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے ۔ مشرک لوگ اپنے بیہودہ عقائد کے تحت کعبہ کا ننگا طواف کرتے تھے ۔ کبیسہ کا اصول اختیار کر کے انھوں نے حج کی ابراہیمی تاریخوں کو بدل دیا تھا۔

اپنی نبوت کے ابتدائی دور میں آپ تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے مگر آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کی گلیوں میں احتجاجی جلوس نکالیں یا موقع پا کر حرم کے بتوں کو توڑنا شروع کر دیں۔ آپ صرف نظریاتی طور پر توحید و آخرت کی دعوت دیتے رہے مگر بتوں کے خلاف کسی قسم کے عملی اقدام سے مطلق پرہیز کیا۔

روایات بتاتی ہیں کہ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوگیا اور عرب کا مرکز اقتدار آپ کے قبضہ میں آگیا اس وقت آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوکر مکہ میں داخل ہوئے اور کعبہ کے گرد طواف کرنا شروع کیا۔ اس وقت کعبہ کے چاروں طرف ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ آپ اس چھڑی سے ایک ایک بت کو ٹھوکر دے رہے تھے اور بت زمین پر گرتے جاتے تھے۔ اس طرح تمام بت اوندھے منھ زمین پر گر پڑے اور اس کے بعد انھیں توڑ کر پھینک دیا گیا، جب آپ ایسا کر رہے تھے اُس وقت آپ کی زبان پر یہ آیت تھی: جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا (بنی اسرائیل ۸۱)

حرم کعبہ کو بتوں سے پاک کرنا اول دن سے مطلوب تھا۔ مگر اقتدار کے حصول سے پہلے آپ نے بتوں کو بالکل نہیں چھیڑا۔ آپ صرف شرک کی تردید اور توحید کے اثبات پر اپنی ساری دعوتی مہم کو مرتکز کرکے چلاتے رہے۔ حرم کو عملاً بتوں سے صاف کرنے کی طرف اقدام آپ نے صرف اس وقت کیا جب کہ مکہ پوری طرح آپ کے زیر اقتدار آگیا اور وہاں آپ کی کسی کارروائی کے خلاف مزاحمت کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔

اقتدار کے باوجود حکمت کا لحاظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو عرب میں یہ رواج تھا کہ لوگ ننگے ہوکر کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کعبہ مقدس ترین جگہ ہے۔ اس لئے ہر قسم کی دنیوی آلائشوں، حتیٰ کہ کپڑے سے بھی پاک ہوکر اس کا طواف کرنا چاہئے۔ یہ ایک انتہائی بری رسم تھی اور یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد ناپسند تھی۔ مگر آپ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں رہے اور کبھی اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا۔ قیام مکہ کے آخری دنوں میں جب کہ آپ کے پیروؤں کی تعداد کئی سو ہو چکی تھی، آپ برہنہ طواف کو اشو بنا کر اس کے خلاف جلوس نکال سکتے تھے۔ مگر آپ نے اس قسم کی کسی بھی کارروائی سے مکمل پرہیز کیا۔

اس کے بعد تاریخ آگے بڑھی اور رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوگیا۔ مکہ قدیم عرب میں ملک کی قیادت کا مرکز تھا۔ مکہ پر قبضہ ملنے کا مطلب یہ تھا کہ پورا عرب آپ کے قبضہ میں آگیا۔ مگر اب بھی آپ نے برہنہ طواف کے خلاف کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ فتح مکہ کے چار ماہ کے بعد حج کا موسم آیا تو مشرکین حسب معمول حج کی ادائگی کے لئے آئے اور پہلے کی طرح ننگے ہوکر کعبہ کا طواف کیا۔ مگر ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ مسلمانوں نے اپنے مطابق حج کے مراسم ادا کئے اور مشرکین نے اپنے مطابق

اس کے بعد اگلے سال (۹ھ) کا حج پڑا۔ یہ عرب میں اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد دوسرا حج تھا۔ مگر اس سال بھی مشرکین کو برہنہ طواف سے نہیں روکا گیا۔ مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کی قیادت میں اپنے طریقہ پر حج کیا اور مشرکین نے اپنے طریقہ پر۔ البتہ دوسرے سال یہ مزید کارروائی کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت علی کو مکہ بھیجا اور ہدایت کی کہ حج کے اجتماع میں لوگوں کے درمیان یہ اعلان کر دیں کہ اِس سال کے بعد آئندہ کوئی مشرک حج کے لئے مکہ نہ آئے اور نہ اب سے کوئی شخص ننگی حالت میں کعبہ کا طواف کرے (لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فتح مکہ کے باوجود، ۸ھ اور ۹ھ میں حج کے لئے مکہ نہیں گئے۔ آپ نے فرمایا کہ مشرکین آئیں گے اور ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کریں گے۔ مجھے پسند نہیں کہ میں حج کروں جب تک یہ چیزیں ختم نہ ہو جائیں (انما یحضر المشرکون فیطوفون عراۃ فلا احب ان احج حتی لایکون ذلک، تفسیر ابن کثیر، سورۃ التوبہ) اقتدار حاصل ہو جانے کے باوجود آپ دو سال تک برہنہ طواف کو برداشت کرتے رہے اور خود حج کے لئے نہیں گئے۔ تیسرے سال (۱۰ھ) میں آپ نے ننگے طواف کو بالکل بند کر دیا اور اسی سال نے جا کر حج ادا فرمایا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج (حجۃ الوداع) تھا۔

تبدیلی فطری رفتار سے

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے کعبہ کی تعمیر کے بعد حج کا جو نظام قائم کیا تھا وہ قمری سال کی بنیاد پر تھا۔ اس بنا پر حج کی تاریخ مختلف موسموں میں آتی تھی۔ کبھی سردیوں میں اور کبھی گرمیوں میں۔ بعد کے زمانہ میں اہل مکہ نے دیکھا کہ اس فرق سے ان کی تجارتوں کو نقصان ہوتا ہے۔ حج کا موسم اہل مکہ کی خوش حالی کا اصل ذریعہ تھا۔ مگر قمری حساب کی بنا پر حج کا مختلف موسموں میں آنا اس راہ میں رکاوٹ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں کھجور کے پکنے کا زمانہ گرمی کا زمانہ تھا۔ قدیم عرب میں گرمی کا زمانہ ایسا ہی تھا جیسے زرعی ہندستان میں جیت کا زمانہ۔ ان دنوں قبائل کے پاس پیسہ ہوتا تھا اور وہ سفر کرنے اور خریداری کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تھے۔ چنانچہ گرمیوں کا حج تجارتی نقطہ نظر سے بہت کامیاب رہتا تھا۔ اس کے برعکس جاڑوں کے حج بہت پھیکے ہوتے تھے۔ تجارتی چہل پہل ختم ہو جاتی تھی۔ اہل مکہ کے لئے ان کی دنیوی مصلحتیں دینی مصلحتوں کے اوپر غالب آگئیں۔ انھوں نے یہود و نصاریٰ سے نسئی یا کبیسہ (Intercalation) کا طریقہ سیکھا اور حج کو ہمیشہ گرمی میں کرنے کے لئے قمری مہینوں کو ہٹا کر شمسی مہینوں کے مطابق کرنے کا اصول اختیار کر لیا۔

قمری سال کے مقابلہ میں شمسی سال تقریباً گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لئے اہل مکہ یہ کرتے تھے کہ قمری سال میں ہر سال کمی کے بقدر اضافہ کر دیتے تھے۔ اس تدبیر کے نتیجہ میں ایسا ہوتا تھا کہ ہر آٹھ سالوں میں تین مہینے بڑھ جاتے تھے۔ اس طرح ہر تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا تھا۔ قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کرنے کی یہ کارروائی حرام مہینوں میں (بشمول ذوالحجہ) کی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں یہ ہوتا کہ مہینے ۳۲ سال کے لئے اپنی جگہ سے ہٹ جاتے تھے اور اسی طرح حج کا

موسم بھی ۳۳ سال کی گردش کے بعد پھر یہ مہینے ایک مرتبہ کے لئے اپنی اصل جگہ پر واپس آتے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ذمہ داری تھی کہ حج کے معاملہ میں اس جاہلانہ رسم کو بدلیں اور حج کی تاریخوں کو ابراہیمی سنت کے مطابق قمری ماہ (ذی الحجہ) میں مقرر کریں۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو آپ اس حیثیت میں ہوگئے کہ سابقہ رسم کے فوری طور پر ختم کیے جانے کا اعلان کر دیں۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ جاہلی رسم کے مطابق ۸ھ اور ۹ھ کا حج ذی قعدہ میں پڑ رہا تھا۔ اور ۱۰ھ کا حج (۳۳ سال پورے کرکے) ذی الحجہ میں۔ اگر آپ چاہتے تو فتح مکہ کے بعد فوراً اعلان کر دیتے کہ اس سال آنے والا حج ابراہیمی سنت کے مطابق (ذی قعدہ کے بجائے) ذی الحجہ میں ادا کیا جائے گا۔ مگر آپ نے عجلت سے کام نہیں لیا۔ بلکہ دو سال انتظار فرمایا۔ اقتدار حاصل ہونے کے باوجود آپ نے اس کو برداشت کیا کہ دو سال تک حج کی ادائیگی ذیقعدہ کے مہینہ میں ہو۔ اور تیسرے سال جب خود فطری رفتار کے مطابق حج کا موسم ذی الحجہ میں آجائے اس وقت اعلان کر دیں کہ اب آئندہ حج کی ادائگی اسی طرح ہو گی جس طرح اس سال ہو رہی ہے ۔

یہی بات ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ (۱۰ھ) میں ان لفظوں میں فرمائی تھی :

ان الزمان قد استدار کھیأتہ یوم خلق اللہ السماوات والارض (تفسیر ابن کثیر)	زمانہ گردش کرتا ہوا اپنی اس حالت پر آگیا ہے جو زمین و آسمان کی تخلیق کے اعتبار سے اس کی اصل حالت ہے

روایات توڑے بغیر اصلاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوۂ مریسیع یا بنی المصطلق (۵ھ) کہا جاتا ہے۔ آپ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار نے فوج جمع کی ہے اور مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے بریدہ بن حصیب اسلمیؓ کو خبر لینے کے لئے بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر تصدیق کی کہ خبر صحیح ہے۔ آپ نے بھی اپنی فوج تیار کی اور تیزی سے چل کر اچانک ان کے اوپر حملہ کر دیا۔ وہ لوگ مقابلہ نہ کر سکے۔ ان کے دس آدمی قتل ہوئے اور تمام مرد و عورت بوڑھے بچے گرفتار کر لئے گئے۔ مال غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

جو لوگ گرفتار ہوئے وہ کل دو سو گھرانے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کر کے انھیں اسلام کی طرف مائل کریں۔ مگر روایت کو توڑ کر آپ نے ایسا کرنا پسند نہیں فرمایا۔ اس زمانہ کی روایت کے مطابق یہ تمام قیدی فوج کے افراد کی ملکیت تھے۔ اگر آپ ان کی آزادی کا اعلان کرتے تو اس روایت کو توڑنا پڑتا ۔ آپ نے اس کی نہایت خاموش تدبیر اختیار فرمائی ۔

قبیلہ کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیوہ لڑکی جویریہ بھی گرفتار شدگان میں تھی۔ تقسیم غنیمت کے وقت وہ

ثابت بن قیس انصاری کے حصہ میں آئیں۔ ثابت بن قیس نے ان سے مکاتبہ کا معاملہ کرنا چاہا یعنی اگر وہ اتنی رقم ادا کر دیں تو وہ آزاد ہیں۔ جویریہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور آپ سے بطور امداد اتنی رقم چاہی جس کو دے کر وہ آزاد ہو سکیں۔ آپ نے فرمایا: کیا میں تم کو اس سے بہتر چیز بتاؤں۔ وہ یہ کہ میں تمھاری طرف سے کتابت کی رقم ادا کر دوں اور تم کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لوں۔ وہ راضی ہو گئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جویریہ کو آزاد کر کے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا۔ جویریہ چونکہ قبیلہ کے سردار کی لڑکی تھیں اس لئے قبائلی رواج کے مطابق اب آپ پورے قبیلہ کے داماد ہو گئے۔ مہاجرین و انصار کو جب یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے جن لوگوں کو قیدی بنایا ہے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامادی کا رشتہ ہے تو ایسے لوگوں کو قید رکھنا انھیں شاق معلوم ہوا۔ انھوں نے تمام قیدیوں کو اپنی طرف سے رہا کر دیا۔ ان قیدیوں کے دل اپنے "داماد" اور اس کے دین کے بارے میں پہلے ہی نرم ہو چکے تھے۔ جنگ میں شکست کے بعد آزاد کر دیا جانا ان کو غیر معمولی طور پر متاثر کرنے کا ذریعہ بن گیا کیونکہ یہ ایسا سلوک تھا جس کا قدیم قبائلی دور میں تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے جلد ہی بعد پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ اسی بنا پر حضرت عائشہ نے جویریہ کے بارے میں کہا: مجھے کوئی ایسی عورت نہیں معلوم جو جویریہ سے زیادہ اپنی قوم کے لئے بابرکت ثابت ہوئی ہو (ما اعلم امرأۃ کانت اعظم علیٰ قومھا برکۃ منھا، سیرۃ ابن ہشام)

موجودہ زمانہ کی تحریکیں

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیاء اسلام کے لئے بے شمار تحریکیں اٹھائیں۔ ان تحریکوں کو غیر معمولی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ مگر اصل مقصود کو حاصل کرنے میں تمام تحریکیں ناکام رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تحریکوں نے فطرت کے ضابطہ کو اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے اس طریق کار کو نہیں اپنایا جو خدا نے ان کے لئے مقرر کیا تھا اور جس کا عملی نمونہ قائم کر کے انھیں دکھا دیا تھا۔

ان تحریکوں نے خاموش تدبیر کے بجائے شور وغل کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے فطری رفتار سے چلنے کے بجائے عاجلانہ اقدام کر کے منزل تک پہنچنا چاہا۔ انھوں نے تدریج کے بجائے چھلانگ کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ اپنی پوزیشن کو مستحکم کئے بغیر بڑی بڑی کارروائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے حکمت کے بجائے شوق اور جذبات کو اپنا رہنما بنایا۔ انھوں نے بنیاد کا کام کئے بغیر اپنی آرزوؤں کا محل کھڑا کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑے سے زیادہ کی طرف بڑھنے کے بجائے انھوں نے چاہا کہ پہلے ہی دن انھیں زیادہ حاصل ہو جائے۔ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ ناکامی تھا اور وہی ان کے حصہ میں آیا۔

خدا کی دنیا میں خدا کے مقررہ ضابطہ پر چل کر ہی کامیابی ہو سکتی ہے۔ کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے

کے بعد خدا کی دنیا میں کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔ خدا نے اپنی دنیا میں کامیابی کا راز اگر صبر میں رکھا ہے تو آپ اس کو جلدبازی کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا نے اگر ایک واقعی نتیجہ کو خاموش جد و جہد سے وابستہ کر دیا ہے تو آپ تقریروں اور بیانات کی دھوم مچاکر اس نتیجہ کو اپنے لئے برآمد نہیں کر سکتے۔ خدا نے کوششوں کا حاصل پانے کے لئے اگر ایک مدت مقرر کر دی ہے تو آپ مدت کی تکمیل سے پہلے اس حاصل کے مالک نہیں بن سکتے۔ خدا نے اگر اپنی دنیا میں نتیجہ خیز عمل کے لئے تدریج کا اصول مقرر کیا ہے تو آپ چھلانگ لگاکر اچانک اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ خدا اگر چاہتا ہے کہ ضروری استحکام کے بغیر کوئی اقدام نہ کیا جائے تو آپ استحکام کے بغیر اقدام کر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا نے اس دنیا کے مسائل کا حل اگر حقیقت پسندانہ طریق عمل میں رکھا ہے تو آپ جذباتیت کے طریقہ پر چل کر اپنے مدعا کو نہیں پا سکتے۔ خدا نے اگر افراد کے اندر کردار کی تعمیر میں قومی اصلاح کا راز رکھا ہے تو آپ اجتماعی ہنگاموں سے قومی اصلاح کے مقصد تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ خدا کا قانون ہے اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔